ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

اپریل ۱۹۹۲ء

شمارے کے سا

یدکارڈ کا تحفہ مفت حاصل

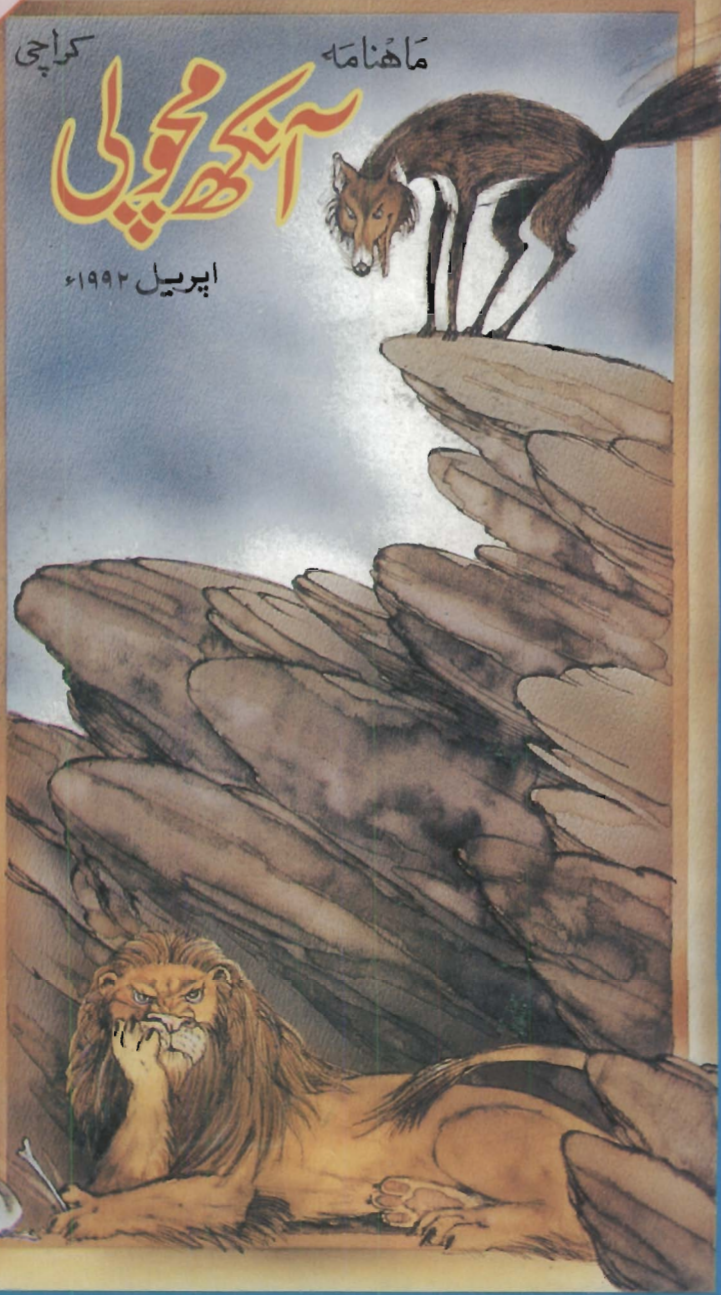

Put
A PANDA IN YOUR PURSE
A PANDA IN YOUR
A PANDA IN YOUR PACK
ROSE PETAL
PANDA
PACK
Made from
100% impported wood
At school, at work or while shopping, hygienic and disposable tissues – so easy to carry!
Hygienic, disposable, easy to carry.
NEED OF THE DAY
A PRODUCT OF PACKAGES LTD.

کرسٹل ٹوتھ پیسٹ

سے آپ کو زیادہ فائدہ

سنگل برش پیک کی قیمت
میں ڈبل برش پیک

برش بھی ڈبل بچت بھی ڈبل

کرسٹل ٹوتھ پیسٹ کے ڈبل برش پیک کی قیمت دوسرے برانڈ کے سنگل برش پیک سے بھی کم ہے! یعنی پندرہ روپے سے بھی زیادہ کی یقینی بچت۔ اتنی زبردست بچت کے ساتھ ایک کارآمد تحفہ یعنی ایٹی پلاک ٹوتھ برش بھی حاصل کریں اور ساتھ میں ریگولر ٹوتھ برش بھی۔ اس طرح بچت بھی زبردست اور دانتوں کی حفاظت بھی زبردست۔

Paxy's®

adds 2 new delights to its family.

CRISPY • CHEWY • NUTTY

CRISPY • CRUNCHY

☐ THAVER

AHMED
تازہ خالص، کھرا مصالحہ
اِس کا شیدا گھر بھر سارا
احمد چٹنی
احمد اچار
تازہ سبزیاں، خالص اجزاء، ملاوٹ سے پاک کھرا مصالحہ
یہی وجہ ہے کہ احمد کے اچار اور چٹنیاں اپنے امتیازی ذائقے
اور خصوصی چٹخارے کی بنا پر دُنیا بھر میں پاکستان کی
شناخت بن چکے ہیں۔
خاص خوبیوں والا احمد لہسن اچار صحت کے لئے
نہایت مُفید ہے۔
AHMED
PLUM
CHUTNEY
PRODUCT OF PAKISTAN
Net wt 14 oz (400 g)
AHMED
PICKLE
Mixed in Oil
PRODUCT OF PAKISTAN
AHMED PRESERVES
قُدرت نے ذائقہ دیا - احمد نے محفوظ کیا

کیچپ تو صِرف

احمد

ٹماٹو کیچپ

ناقابلِ یقین | حیرت انگیز | لاجواب | بے مثال

آنکھ مچولی

ویڈیو میگزین

پاکستان میں پہلی بار اپنی طرز کا انوکھا، جدید اور لاجواب چلتا پھرتا ویڈیو میگزین
جسے آپ وی سی آر کے ذریعے اپنے ٹیلیویژن پر دیکھ سکیں گے

ماہنامہ آنکھ مچولی کی فخریہ پیشکش

- خوبصورت ڈرامے
- مزے دار خاکے
- لاجواب نغمے
- گیت اور ٹیبلو
- معروف شخصیات
- مشہور کردار
- مزاحیہ خبریں
- سنجیدہ گفتگو
- کام کی باتیں

اور... اور وہ سب کچھ جو آپ ایک خوبصورت ویڈیو کیسٹ میں دیکھنا پسند کریں

○ ..... آپ اپنے آرڈر سے جلد از جلد مطلع فرمائیں۔
○ ..... اپنی گلی محلے کی ویڈیو کیسٹ شاپ کو ابھی سے مطلع کر دیں۔

۲۳ مارچ ۹۲ء کو اپنی تکمیل کے بعد بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے۔

جب کھائیں، تازہ پائیں!

احمد ©

پکے پکائے کھانے

دیس ہو یا پردیس، سفر میں کھانا کچھ یونہی سا ملتا ہے۔ پھیکے، سیٹھے اور بدمزہ کھانے نہ تو جی کو لگتے ہیں اور نہ بدن کو۔ احمد کے سرسبز، پکے پکائے کھانے جن کی تازگی اور خوشبو ایئر ٹائٹ ڈبوں میں محفوظ کر دی جاتی ہے، لذیذ اور صحت بخش ہونے کے ساتھ ساتھ باکفایت بھی رہتے ہیں۔ صحت، سہولت اور کفایت کے لئے سفر میں ہمیشہ احمد کے پکے پکائے کھانے ساتھ رکھیئے۔

نہاری۔ قورمہ۔ آلو قیمہ۔ کوفتہ۔ پایا
حلیم۔ سرسوں کا ساگ۔
چکن کری۔

قدرت نے ذائقہ دیا، احمد نے محفوظ کیا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

مسلسل دوسری بار اعلیٰ معیار کا ایوارڈ حاصل کرنے والا
پاکستان کا واحد ماہنامہ

مدیرِاعلیٰ ظفر محمود شیخ

مدیرِ مسؤل تجمل حسین چشتی

مشاورت مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مدیرانِ اعزازی طاہر مسعود، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت ساجد سعید، منیر احمد راشد

اشتہارات محمد عرفان

نمائندہ امریکہ عبدالرشید خان

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی،
آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی سکتی۔

ماہ نامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار وواقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

ماہ نامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیرالدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت وکردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا۔

جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱ اپریل ۱۹۹۲ء رمضان/شوال ۱۴۱۲ھ فون ۲۹۹۱۷۸ قیمت ۱۰ روپے ۷ ریال ۷ درہم

ناشر: ظفر محمود شیخ طابع: زاہد علی مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲۴۔ ڈی، نورس روڈ، سائٹ کراچی

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی
سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے
رہیں گے۔

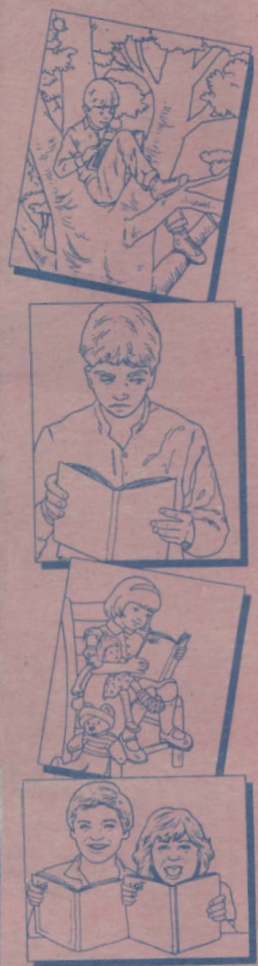

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام
اور پتہ ضرور لکھئے۔
دیگر ممالک کے لئے زر سالانہ کی
شرح -/۳۰۰ روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہنامہ آنکھ مچولی — ڈی - ۱۱۲، سائیٹ کراچی

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے	ادارہ	۸
ماہ راوں کی پہلی بات	اداریہ	۹
حمد باری تعالیٰ (نظم)	ریاض حسین قمر	۱۰
بہ خدمت جناب	خطوں کے جواب	۱۱
کشمیری بچے کی دعا (نظم)	سید نظر زیدی	۱۵
دنیا کا سب سے مہنگا گھر	خالد خلیل	۱۸
دوستی	سید نظر زیدی	۲۰
نیکی کر بھلا ہوگا	نائلہ صدیقی	۲۷
ان سیاروں پر.....	عشرت رضیہ	۳۱
عید آئی (نظم)	ضیاء الحسن ضیاء	۳۵
کتے بھی اب کھیلتے ہیں.....	ش - م - خالد	۳۶
میر صحافت	طاہر مسعود	۳۹
چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	۴۴
کرشمہ	اظہر نیاز	۴۷
نانی اماں	شازیہ فرحین	۵۵
گلگلے	منتخب لطائف	۵۹
پھلوں کا مشاعرہ	عنایت علی خان	۶۳
رابطہ	عامر یونس	۷۱
ادیب کی کہانی	نیر مسعود	۷۸
تاج محل	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۸۳
بے حقیقت کچھ	سید عقیل عباس جعفری	۸۸
ہمارا گھر (نظم)	عبدالقادر	۹۰
حیرت ناک اور دلچسپ مقابلے	اُمِّ کاشان	۹۲
موت انہیں چھو کر گذر گئی	امتیاز جلیل	۹۴
مہارشی بالمیک	انتخاب	۱۰۰
درِ عبرت	ادارہ	۱۰۳
بے گناہ مجرم	جبران ملک	۱۰۷
اژدھا کہانی	سید عرفان علی یوسف	۱۱۱
عورت جس کے نام فیرنی تھا	انتخاب	۱۱۵
قلم قتلے	مختصر تحریریں	۱۱۹
ساتھی بچپن کے	تعارف	۱۲۹
امی ابو کا صفحہ	ہما سلیم	۱۳۴

خلیفہ عمرؒ بن عبدالعزیز کی بیوی نے ان سے کہا "بچوں کے لئے اچھے کپڑوں کا انتظام کرنا ہے، عید سر پر آئی ہے۔"

خلیفہ نے کہا، "معلوم ہے لیکن کیا کر سکتا ہوں"

بیوی نے کہا، "سلطنت کے امیروں اور سرداروں کے بچے عید کے دن اچھے اچھے کپڑے اور زیورات پہن کر نکلیں گے اور خلیفہ کے بچے خستہ حال ہوں گے، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔"

خلیفہ عمر نے کہا، "میں مجبور ہوں، مجھے منصبِ خلافت کا جو روزینہ ملتا ہے اس میں سے بچوں کے لئے اچھے کپڑے تیار نہیں ہو سکتے۔"

بیوی بولیں، "وہ آپ مجھے ایک ہفتہ کا روزینہ پیشگی دے دیجئے۔ میں اس میں سے کچھ بچا کر کپڑے خرید لوں گی"۔

خلیفہ نے جواب دیا، "کیسے معلوم کہ میں ایک ہفتہ زندہ رہوں گا؟ اگر زندہ رہوں بھی تو یہ کون کہہ سکتا ہے کہ لوگ مجھے ہفتہ ختم ہونے سے پہلے اس منصب سے نہیں ہٹا دیں گے"؟

ماہِ رواں کی پہلی بات

عید اللہ کا انعام ہے۔

یہ انعام ہے اس بات کا کہ ہم نے اللہ کی اطاعت کی، اس کے رسولؐ کی اطاعت کی۔ اس کا حکم مانا، اپنے نفس کا حکم نہیں مانا۔ اس کے آگے سر جھکایا، اپنی خواہشات کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جسے اس نے بُرائی کہا، اسے ہم نے بُرائی سمجھا، جس عمل کو اس نے نیکی کہا، اس عمل کو ہم نے اختیار کیا۔

بے شک سب سے بری غلامی اپنی خواہشات کی غلامی ہے۔ عید اس لئے اللہ کی نعمت ہے کہ ہم کامل ایک ماہ تک اس غلامی سے آزاد رہے۔ اور اس طرح آزاد رہے کہ جب رات کے پچھلے پہر کی نیند ہماری پلکوں کو بوجھل کر دیتی تھی تو سحری کی آواز پہ ہم اپنی نیند کو جھٹک کے اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اللہ کے حضور جھک جاتے تھے۔ جب شدید بھوک سے ہماری انتڑیاں سوکھنے لگتی تھیں اور پیاس سے ہونٹوں پہ پپڑیاں جم جاتی تھیں تو بھی ساری تکلیفیں ہم سہہ لیتے تھے لیکن اللہ سے کئے ہوئے عہد کو نہیں توڑتے تھے۔ صرف اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہم کسی سے جھگڑے نہیں، کسی کو بُرا نہیں کہا۔ کسی کی غیبت نہیں کی، کسی سے چالبازی نہیں کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ کسی نے زیادتی کی تو اسے معاف کر دیا، کسی نے برا کہا بھی تو نظرانداز کر دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسی میں ہمارے رب کی خوشی تھی..... اور اس کی خوشی میں ہم خوش رہے۔ عید اللہ کا تحفہ ہے۔ اور ہر تحفہ ایک عہد ہوتا ہے۔ اس بات کا عہد کہ محبت کا جو تعلق قائم ہوا ہے وہ باقی رہے گا..... اس عید کا عہد یہ ہے کہ

- ..... جو عبادت ہم نے مہینے بھر کی اس کا سلسلہ سال بھر قائم رہے گا۔
- ..... جن برائیوں سے ہم نے خود کو دور رکھا، ان کے قریب ہم آئندہ بھی نہیں پھٹکیں گے۔

عید کے معنی ہرگز یہ نہ ہوں گے کہ ہم آزاد ہوگئے وہ سب کچھ کرنے کے لئے جن سے ہم نے اب تک پرہیز کیا تھا۔

عید خوشی کا انمول دن ہے۔ اور اس دن کا صحیح لطف اسی صورت میں آسکتا ہے کہ ہم اپنی خوشیوں میں سب کو شریک رکھیں۔ خاص طور پر غریبوں کو، اور ضرورت مندوں کو..... اور اپنے ان بھائیوں کو ہرگز فراموش نہ کریں جو کشمیر میں، فلسطین میں، افغانستان میں، ڈھاکہ کے محصور کیمپوں میں اپنی زندگی کے اذیت ناک دن گزار رہے ہیں۔

آپ کا دوست!

ظفر محمود شیخ

اللہ سب کو عید کی خوشیاں مبارک کرے!

حمد باری تعالیٰ

ریاض حسین قمر

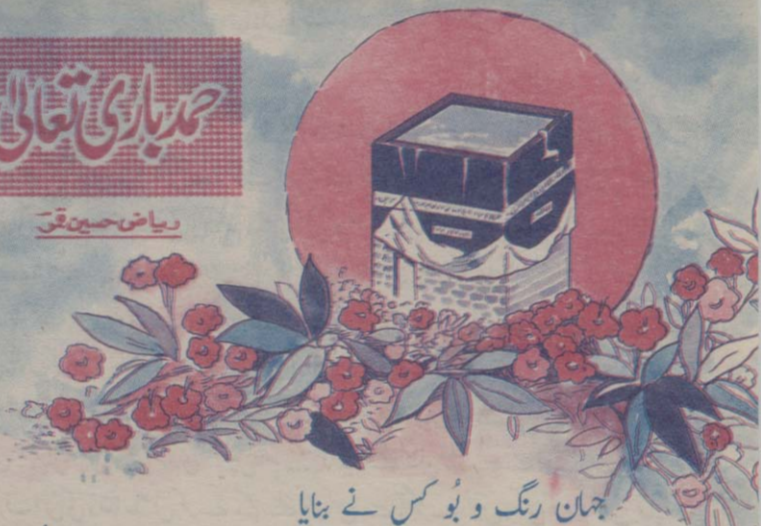

جہان رنگ و بُو کس نے بنایا
زمیں پر ہر طرف سبزہ اُگایا
کہیں پر، ریتلے میداں بنائے
کہیں پھلدار ہیں بوٹے اُگائے
دلوں کو پُر سکوں کس نے بنایا
فلک کو بے ستوں کس نے بنایا
رکھے زیرِ زمیں کس نے خزانے
یہ سب کچھ کر دیا میرے خدا نے
اسی نے رزق بخشا ہر کسی کو
بنایا ایک نعمت زندگی کو
مریضوں کو شفا دیتا وہی ہے
گناہوں کی سزا دیتا وہی ہے
وہ خالق ہے زمین و آسماں کا
وہ مالک ہے مکاں و لا مکاں کا

بہ خدمت جناب

انیلا ناز عمر۔ کراچی:۔ آپ ایک "انسانیت نمبر" بھی نکالیں کیونکہ ہمارے معاشرے میں آدمی تو موجود ہیں مگر انسانوں کی بہت کمی ہوگئی ہے۔ مزید یہ کہ جو انسانیت کا مفہوم نہیں جانتے اور جانوروں کو انسانوں پہ فوقیت دیتے ہیں، اپنی منفی سوچ اور منفی کردار کو تبدیل کر سکیں۔

○ ..... تجویز تو اچھی ہے۔ لیکن کیا خیال ہے پہلے ایک عدد "حیوانیت نمبر" نہ نکالا جائے تاکہ لوگوں کو پہلے انسانیت اور حیوانیت کا فرق تو معلوم ہو جائے۔

صائمہ گل، بلدیہ ٹاؤن کراچی:۔ انکل! یہ کیا؟ رسالہ تو بالکل بدل گیا ہے۔ لیکن یہ نیا پن دل کو بھایا۔ ہاں لیکن آپ ہماری تحریر نہیں چھاپیں گے؟

○ ..... لیجئے ہمیں تو پتا بھی نہیں چلا۔ آپ کے کہنے پر دیکھا تو لگا آپ ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ رسالہ تو بدل گیا اب ذرا آپ اپنے لکھنے کا انداز بھی تو بدل کر دیکھئے۔

مجاہد عبد الولی، نصرپور:۔ بہت سے لڑکے مجھ سے بحث کرتے ہیں کہ آنکھ مچولی، اچھا رسالہ نہیں (جو آنکھ مچولی نہیں پڑھتے ہیں وہ کہتے ہیں) پھر میں ان کو رسالے کے مضامین سے ثابت کر کے دکھاتا ہوں کہ آنکھ مچولی کیسا رسالہ ہے۔

○ ..... آپ کے دوست آپ کو چھیڑتے ہوں گے۔ اور آپ بحث نہ کیا کیجئے۔ انہیں رسالہ پڑھنے کے لئے دے دیا کیجئے۔ انشاء اللہ وہ خود قائل ہو جائیں گے۔

صفدر سعید صفدر، ملیر کالونی، کراچی:۔ رسالہ حسب سابق ۸۹ فیصد اچھا رہا جبکہ ۱۱ فیصد غلطیاں ہمیشہ کی طرح دیکھنے میں آئیں جو رسالے کے شایان شان نہیں ہیں۔

○ ..... بھئی رسالہ بھی انسان ہی نکالتے ہیں اس لئے غلطیوں سے بچ کیسے سکتے ہیں۔ پھر بھی کوشش کریں گے کہ آئندہ غلطی نہ ہو۔

ایمان شاہ، میٹھا خیل:۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دھاندلی ہر جگہ موجود ہے۔ پہلے تو میں سمجھتا تھا کہ آنکھ مچولی ایسا ادارہ نہیں ہو سکتا لیکن اب یقین ہو گیا ہے۔ میں کتنی محنت سے معلومات اکٹھی کرتا ہوں، لطائف جمع کر کے بھیجتا ہوں لیکن میری ساری محنت ردی کی ٹوکری میں چلی جاتی ہے۔ آخر یہ نوکری ہے یا میری دشمنی؟

○ ..... شاباش! آپ نے تو یکطرفہ فیصلہ کر دیا۔ بھئی کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی معلومات اور لطیفے رسالے کے معیار پر پورے نہ اترے ہوں۔ دیکھئے یہ بے ایمانی والی بات آپ فوراً واپس لیجئے ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔

رضوانہ شاہ، میانوالی:۔ جس کہانی پر میں نے ایک ماہ سے بھی زیادہ عرصہ لگایا معلوم ہوا کہ اس کی جگہ رسالے میں نہیں ردی کی ٹوکری میں ہے۔ اگر آپ نے میری کہانی شائع نہ کی تو رسالہ لینا بند کر دوں گی۔ یہ دھمکی نہیں ہے۔

○ ..... کیا آپ رسالہ صرف اپنی کہانی چھپوانے کے لئے لیتی ہیں؟ اگر ایسا ہے پھر تو آپ رسالے کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔

فیاض احمد، میاں چنوں:۔ انکل! سچ سچ بتایئے کہ میں نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے جو آپ میرے خطوط شائع نہیں کرتے؟ ہم اتنے پیار سے خط لکھتے ہیں اور آپ بغیر پروا کئے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ اب میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔

○ ..... آپ پیار سے خط لکھتے ہیں اور ہم پیار سے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں۔ ویسے اب آپ کی ناراضگی دور ہو جانی چاہئے۔

رسول بخش شاہین، ڈیرہ اللہ یار:۔ میں نے آپ کو تفصیلی خط لکھا اور جواب نہ پا کر نیم پاگل ہو گیا۔ میں کوئی ادیب وغیرہ نہیں ہوں۔ بس بچوں کے لئے اقوال زرّیں اور لطیفے وغیرہ چھپواتا رہتا ہوں۔ اور وہ بہت جلد شائع ہو جاتے ہیں۔

○ ..... شاہین میاں! ادیب نہ ہونے کے باوجود آپ اتنے جذباتی ہیں۔ ہمیں بھی لطائف بھجوایئے جو اچھے ہوں گے وہ شائع ہو جائیں گے۔

محمد اسماعیل، میانوالی:۔ اخبارات اور ٹی وی ایک طرف لکھتے ہیں کہ سگریٹ نوشی صحت کے لئے مُضر ہے اور دوسری طرف سگریٹ کی کمپنیوں کو متعارف کرواتے ہیں۔ آخر کیوں؟

○ ..... اس لئے کہ ان اشتہارات کے بدلے انہیں رقم ملتی ہے اور ان کے نزدیک روپیہ پیسہ انسانی جان سے زیادہ قیمتی ہے۔

محمد اسلم ناگوری، (؟):۔ اس دفعہ رسالہ تاخیر سے ملا۔ وقت مقررہ پر کام کرنے کو سب کہتے ہیں مگر خود وقت کی پابندی کرنا مشکل کام ہے۔

○ ..... آپ کی تنقید بجا ہے۔ ہم اپنے پڑھنے والوں سے واقعی شرمندہ ہیں۔ انشاء اللہ اب تاخیر نہیں ہوگی۔

عدیلہ تعیظم، راولپنڈی:۔ آپ نے اپنے رسالے میں جدت پیدا کر کے لگتا ہے پھر بہترین رسالے کا ایوارڈ حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آپ نے ان تمام ساتھیوں کے منہ بند کر دیئے ہیں جو اس کو پسند نہیں کرتے۔

○ ..... ہم ان ساتھیوں کو نہیں جانتے جو آنکھ مچولی کو ناپسند کرتے ہیں، رسالے میں جدت اسی لئے پیدا کی گئی ہے کہ آپ لوگ اسے پسند کریں۔ ایوارڈ کا معاملہ تو ایوارڈ دینے والے جانیں۔

مجاہد حسین باسط، اوکاڑہ:۔ ہماری کوئی چیز نہ چھاپنے کی قسم آپ نے کس کے کہنے پر کھائی ہے۔ ذرا چپکے سے ہمارے کان میں اس کا نام تو بتا دیجئے۔

○ ..... ذرا نزدیک آیئے۔ لیکن ٹھہریئے۔ ہم نے نام بتا دیا تو آپ اس سے ناراض ہو جائیں گے۔ اور ہم بی جمالو کا کام نہیں کرتے۔

طارق محمود، مردان:۔ رسالہ پہلی مرتبہ خریدا، جی خوش ہو گیا۔ میرے ایک چچا صلاح الدین پانی میں ڈوب کر شہید ہوئے۔ آپ ان کے حق میں دعائے مغفرت کیجئے۔

○ ..... اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

محمد ریحان، اسلام آباد:۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق ایک ایک لائن چھوڑ کر اور صفحہ کے ایک طرف لکھتا ہوں اور میری لکھائی بھی خراب نہیں ہے پھر بھی میری تحریر کیوں نہیں چھپتی؟

○ ..... سب باتوں پر آپ نے توجہ کر لی لیکن یہ نہیں سوچا کہ جو کچھ آپ نے لکھا خود اس کا معیار کیا ہے؟

سید سفیان کاکا خیل، اسلام آباد:۔ انکل! کون کون سی تحریروں کے ساتھ کوپن بھیجنا ہوتا ہے؟ کیا ہم تمام تحریر ایک لفافے میں بھیج سکتے ہیں۔

○ ..... آپ جو بھی تحریر بھیجیں، کوپن ضرور منسلک کریں۔ جی ہاں۔ آپ تمام تحریریں ایک لفافے میں بھیج سکتے ہیں۔

محمد بلال، لطیف آباد، حیدر آباد:۔ رسالے سے اشتہارات کم کریں اور زیادہ معلومات شائع کریں۔

○ ..... زیادہ معلومات شائع کرنے والی بات پر تو سوچا جا سکتا ہے لیکن اشتہارات آپ کو کیا نقصان پہنچاتے ہیں؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ اشتہار کے بغیر اچھا رسالہ نکالنا ممکن نہیں ہے۔

سید مراد علی شاہ، بکیرا شریف:۔ ہمارے شہر میں ایک سوا تین فٹ کا شخص رہتا ہے، میں نے اس کا انٹرویو لیا ہے کیا میں وہ آپ کو تصویر کے ساتھ ارسال کر دوں۔

○ ..... ضرور بھیجئے۔ اگر انٹرویو میں سوال و جواب اچھے ہوئے تو شائع ہو جائے گا۔

سید واصف اسلم، نواب شاہ:۔ سالانہ ممبر شپ کے لئے ڈاک ٹکٹ روانہ کریں یا پیسے؟

○ ..... ممبر شپ فیس منی آرڈر کر سکتے ہیں۔

فرزانہ اشرف بٹ، کوئٹہ:۔ آنکھ مچولی، پہلے مجھے میرے ایک شاگرد نے پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ مگر اب یہ مجھے اتنا پسند ہے کہ میں اسے ہر ماہ اپنے لئے علیحدہ منگواتی ہوں۔ کہانی بھیج رہی ہوں۔

○..... شکریہ۔ آپ کا بھی اور آپ کے شاگرد کا بھی۔ کہانی پڑھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔

محمد نذیر طاہر، گگو منڈی:۔ روشن مثال، میں ہم نے بھی اپنی روشن مثال پیش کی تھی۔ ویسے کہیں آپ رشوت تو نہیں لیتے۔ اگر لیتے ہیں تو آپس کی بات ہے ہمیں بتادیں ہم بھی آپ کی مٹھی گرم کر دیں گے۔

○..... جی ہاں۔ رشوت تو لیتے ہیں۔ لیکن صرف اچھی تحریر کی صورت میں۔

آنکھ مچولی کو درج ذیل ساتھیوں کے بھی خطوط ملے ہیں۔ ادارہ ان کا شکر گزار ہے

(۱) آصف محمد، کراچی (۲) نذرانہ غفار، مینگورہ (۳) سید وقار حیدر رضوی، وہاڑی (۴) روبینہ ناز مغل، کراچی (۵) خاور مجید ڈی آئی خان (۶) محمد ارشد سلیم، ضلع چارسدہ (۷) محمد صدیق، شیخوپورہ (۸) وحید عامر، بورے والا (۹) رفاقت اللہ یوسف زئی، ڈیرہ اسمٰعیل خان (۱۰) عظمیٰ رفیق، لالہ موسیٰ (۱۱) سید اصغر علی (؟) (۱۲) رضا حسین شیخ، گھوٹکی (۱۳) سید علی مرتضیٰ، ملتان (۱۴) عمران احمد جمیل، لاہور (۱۵) محمد زبیر اعوان، خاص میال شریف (۱۶) شاکر اللہ، نوشہرہ (۱۷) عابدہ بینی عامر، لاہور (۱۸) مدد علی، پاک پتن (۱۹) محمد اشرف وار برٹن (۲۰) محمد بلال قریشی، ملتان (۲۱) اشعر فواد، ملتان (۲۲) امین عاصم، کراچی (۲۳) شیر نواز گل، مردان (۲۴) شبانہ حنیف، ٹنڈو آدم (۲۵) میں عبدالستار خان، وہاڑی (۲۶) محمد شریف احمد، راولپنڈی (۲۷) حمنہ احمد سحر، گوجرانوالہ (۲۸) خالد محمود علوی، راولپنڈی (۲۹) شمیلہ احمد (؟) (۳۰) عبدالماجد مغل، گھوٹکی (۳۱) ہما فرح (؟) (۳۲) شیراز حسن بھٹہ، مظفر گڑھ (۳۳) شمس الرحمٰن ضلع اٹک (۳۴) اللہ دتا، چنیوٹ (۳۵) محمد امین، لاہور (۳۶) راشد مہناس خاتب، قصور (۳۷) سید مراد علی شاہ، ٹنڈو الہ یار (۳۸) ذیشان اظہر چوہدری، رحیم یار خان (۳۹) فراز سعید، کراچی (۴۰) راحیل بن یحییٰ، حیدر آباد (۴۱) جتندر نند کشور، حیدر آباد (۴۲) وقار احمد، نشتر کالونی، کراچی (۴۳) محمد ایاز، کیماڑی، کراچی (۴۴) محمد اشرف گھانچی، لیاری، کراچی (۴۵) محمد حفیظ مبین، سکھر (۴۶) اظہر رضا اجنبی، لالوکھیت، کراچی (۴۷) فرزند علی ظہیر القریش کیماڑی کراچی (۴۸) نازش فیاض ربیع، چکوال (۴۹) نوید ڈار، کوئٹہ

(۵۰) جہانگیر احمد، ضلع قصور (۵۱) یوسف خان، ملیر، کراچی (۵۲) ایف سبحان، لانڈھی، کراچی (۵۳) شفقت خان (؟) (۵۴) مجلد حسین باسط، اوکاڑہ (۵۵) محمد عمران فاروقی، ناظم آباد، کراچی (۵۶) محمد معصوم سندیلہ، خیرپور (۵۷) عمر ریاض ساگری دینہ، ضلع جہلم (۵۸) مجید اللہ ساجد، کوٹ قاضی (۵۹) قیصر محمود قیاسی، مانسہرہ (۶۰) محمد شکیل، ضلع کراچہ (۶۱) ضیاء الحسن انصاری، بہاولپور (۶۲) ناصر محمد شنواری، ہنگو (۶۳) محبوب عبدالرزاق، فیڈرل بی ایریا، کراچی (۶۴) محمد عارف، تحصیل جمانیہ منڈی (۶۵) محمد یوسف رحمانی، ضلع گجرات (۶۶) رفیع اللہ سواتی، اوڈیگرام، سوات (۶۷) ثمرین مجید، ڈیفنس، کراچی (۶۸) حزب اللہ خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان (۶۹) امداد احمد مغل، لدھانہ (۷۰) آصف قریشی، نواب شاہ (۷۱) عبداللہ قریشی، چترپڑی، آزاد کشمیر (۷۲) عمارہ رفیع، کراچی (۷۳) کمال ایوب صدیقی، ملتان (۷۴) صاعقہ ایوب، ہری پور (۷۵) معظم اختر، م ن اختر، لاہور (۷۶) راشد اشرف اعوان، حیدر آباد (۷۷) صائمہ، جڑانوالہ (۷۸) فہیم عزیز، لانڈھی، کراچی

کشمیری بچّے کی دُعا

سیّد نظر زیدی

مرے خالق، مرا کشمیر اب آزاد ہو جائے
مسلمانوں کا یہ گھر ہے، یہ پھر آباد ہو جائے

بچا لے ظالموں کے ظلم سے میرے خدا ہم کو
میرے مالک معزز اور طاقت ور بنا ہم کو

بچا لے اے خدا ہم کو غلامی کی مصیبت سے
اندھیرا دور کر دے اے خدا اب میری جنت سے

مرا کشمیر خوشحالی کی برکت سے چمک اٹھے
نہ کوئی شیخ عبداللہ نحوست بن کے اب آئے

خداوندا سنور جائے مرے کشمیر کی قسمت
عطا کر دے ہمارے غازیوں کو فتح کی عظمت

مرا کشمیر اے اللہ، پاکستان بن جائے
بہت ذی شان تھا یہ پھر بہت ذیشان بن جائے

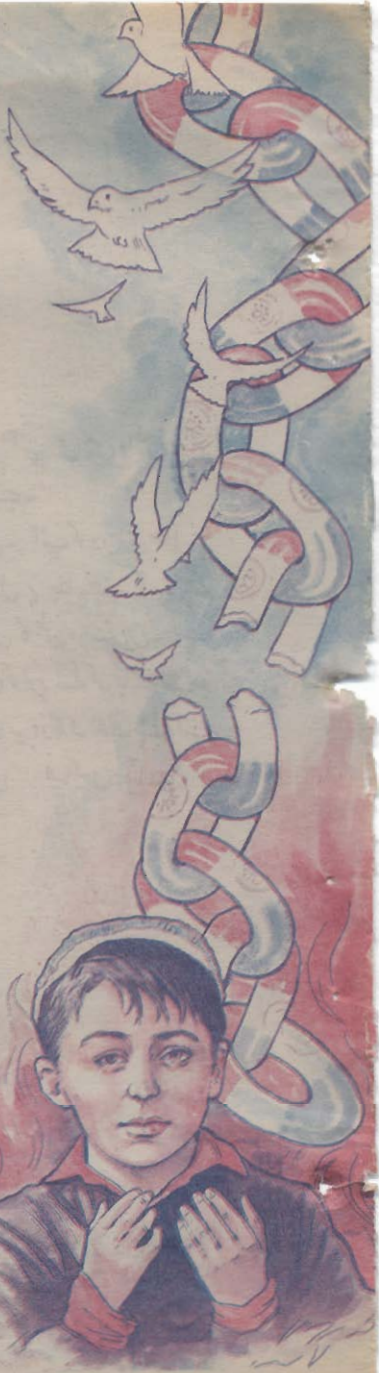

صحیح ترتیب

عبدالسلام عادل

آپ نے دیکھا ہو گا کہ اونچی اونچی عمارتوں میں لفٹ لگی ہوتی ہے۔ آپ اس میں داخل ہو کر اپنی منزل کا بٹن دباتے ہیں اور وہ آپ کو آپ کی مطلوبہ منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

فرض کیجئے کہ کئی آدمی ایک ہی وقت میں لفٹ میں سوار ہوتے ہیں۔ آپ کو دوسری منزل پر جانا ہے اور آپ کے ساتھ سوار ہونے والوں کو ساتویں اور آٹھویں منزل پر جانا ہے۔ آپ کے ساتھی مسافر آپ سے پہلے اپنی منزل کا بٹن دباتے ہیں اور پھر آپ اپنی منزل کا بٹن دباتے ہیں۔ لفٹ چلتی ہے تو ایسا ہرگز نہیں ہو گا کہ لفٹ پہلے آپ کے ساتھ سوار ہونے والوں کو اوپر لے کر جائے اور بعد میں آپ کو دوسری منزل پر لا کر اتارے۔ بٹن دبانے کی بے ترتیبی کے باوجود یہ ہو گا کہ لفٹ پہلے آپ کو دوسری منزل پر اتارے گی اور بعد میں اوپر کے مسافروں کو لے کر اوپر جائے گی..... ایسا کیوں ہوتا ہے.....

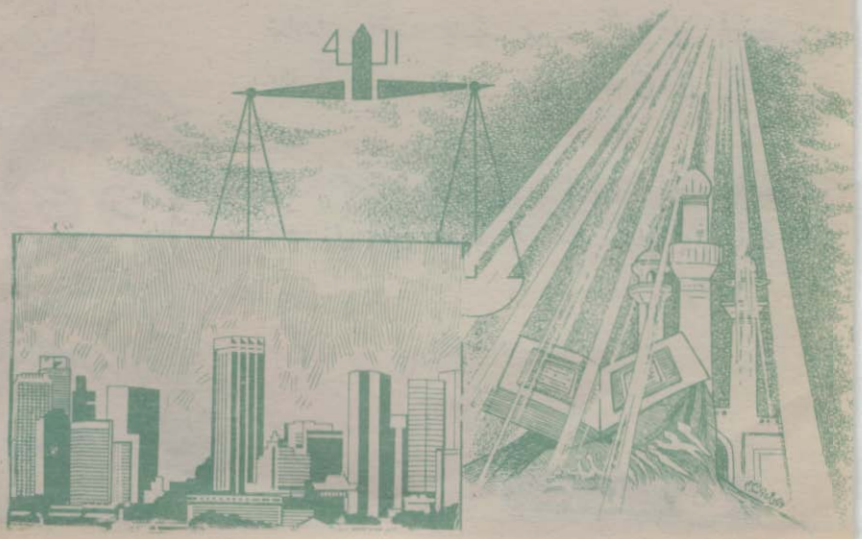

جی ہاں کمپیوٹر کی وجہ سے ..... جدید قسم کی لفٹ میں کمپیوٹر لگا ہوتا ہے جو ایک قسم کا مشینی دماغ ہوتا ہے۔ یہ مشینی دماغ بٹن دبانے کے بے ترتیبی کو منزل کی ترتیب میں بدل دیتا ہے۔ اور لفٹ کو حکم دیتا ہے کہ مسافروں کو منزلوں کی اصل ترتیب کے لحاظ سے اوپر لے جائے۔

اندازہ کیجئے اللہ تعالیٰ کی اس ادنیٰ سی مخلوق میں کس قدر صلاحیت ہے کہ وہ از خود مصنوعی ترتیب کو اصل ترتیب میں بدل دیتی ہے۔ یہی صلاحیت خود خالق میں کتنی زیادہ ہوگی۔ بلاشبہ جو صلاحیت اور طاقت لفٹ میں صرف معمولی حد تک پائی جاتی ہے اللہ تعالیٰ میں وہ صفت درجۂ کمال تک پائی جاتی ہے۔

یہ دنیا انسان کے لئے امتحان گاہ ہے۔ جہاں اس نے اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا مقام مقرر کر لیا ہے۔ لوگوں نے اپنا نام مصنوعی ترتیب کے ساتھ لکھ لیا ہے۔ اب یہاں پر کوئی دوسرے درجے کا آدمی ہے تو کوئی تیسرے درجے کا جب کہ کسی نے خود کو اوّل درجے کا آدمی مقرر کر رکھا ہے۔ یہ ترتیب انسان کی اپنی ترتیب ہے۔ مصنوعی ترتیب ہے کہ جو یہاں نچلے درجے پر بٹھائے جانے کے قابل ہے تو اس نے خود کو سب سے اونچی سطح پر بٹھا رکھا ہے مگر جسے سب سے اونچی سطح پر ہونا چاہئے وہ انتہائی نچلی سطح پر ہے اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔

آخرت میں یہ ساری ترتیب درست ہو جائے گی۔ ادنیٰ آدمی کو ادنیٰ سیٹ پر اور اعلیٰ درجے کے آدمی کو اعلیٰ سیٹ پر بٹھایا جائے گا۔ اور درجات کی اصل ترتیب وہی ہوگی جو اللہ تعالیٰ ترتیب دے گا۔ یہ اصل ترتیب انسان کے اچھے اور بُرے اعمال کو مدنظر رکھتے ہوئے مرتب ہوگی۔ کسی بھی انسان کی کوئی نیکی ضائع نہیں کی جائے گی خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو..... اور کسی بھی انسان کو اس کی ہر برائی کا حساب ہوگا خواہ وہ ذرّہ برابر ہی کیوں نہ ہو..... اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

"تو جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

اعلان

آنکھ مچولی کا مستقل سلسلہ، کوئز کہانی، چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس ماہ شائع نہیں ہو سکا۔ نئی کہانی اور گزشتہ کہانی کے درست جوابات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے!
(ادارہ)

دُنیا کا سب سے مہنگا گھر

خالد خلیل

تصویر میں نظر آنے والا یہ گھر دنیا کا سب سے مہنگا گھر ہے اس کا نام Hearst Ranch ہے اور یہ کیلی فورنیا، امریکہ میں واقع ہے۔ اس گھر کو تعمیر ہونے میں تقریباً سترہ سال کا عرصہ لگا۔ اس گھر کو تعمیر کرانے والا ولیم رنڈلف ہرسٹ تھا۔ تعمیر کے وقت اس گھر پر کل لاگت ۳۰ ملین ڈالر (تقریباً ۷۵ کروڑ روپے) آئی تھی۔ اس گھر میں ایک سو کمرے، ایک ۳۲ میٹر لمبا سوئمنگ پول، ایک ۲۵ میٹر لمبا اسمبلی ہال اور ایک گیراج بھی ہے جس میں بیک وقت ۲۵ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی ہیں۔ اس گھر کی دیکھ بھال کے لئے ہر وقت ۶۰ ملازم موجود رہتے ہیں۔

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچّوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی — ہر شام سہانی

دُنیا کا سب سے مہنگا گھر

خالد خلیل

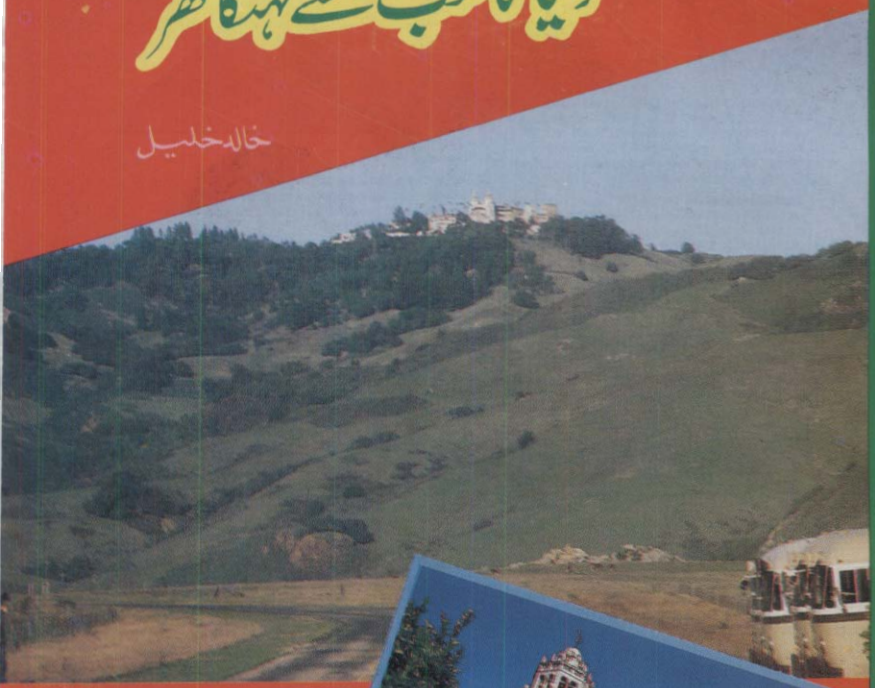

حسین سبزہ زاروں میں گھرا ہوا عظیم الشان گھر

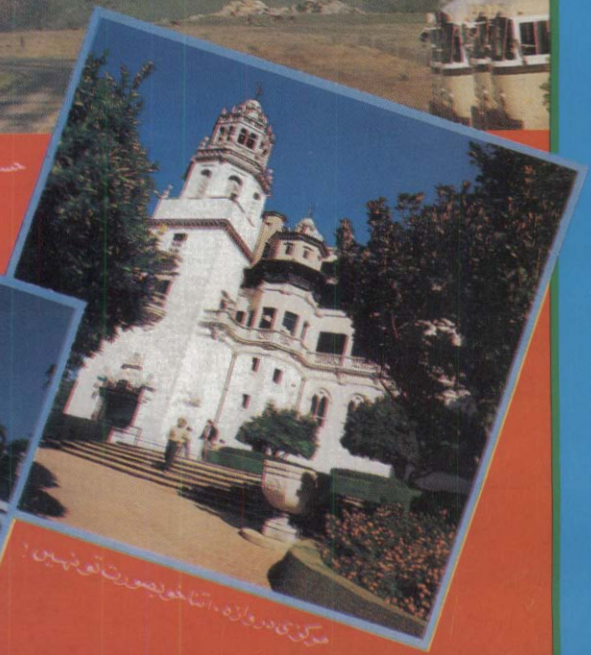

مرکزی دروازہ، اتنا خوبصورت تو نہیں

دوستی

سیّد فضل زیدی

امجد کے ابو راولپنڈی سے تبدیل ہو کر لاہور آئے تھے اور آج اسکول میں اس کا پہلا دن تھا۔ اسے تیسری قطار میں جگہ ملی تھی اور وہ اپنی عادت کے مطابق وقت سے کچھ پہلے ہی آگیا تھا۔ ڈیسک پر کتابیں اور کاپیاں رکھ کر اس نے اردو کی کتاب کھولی اور مشکل لفظوں کے معنی یاد کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد ہی دوسرے طالب علم ایک ایک دو دو کر کے آتے گئے اور اپنی اپنی جگہ بیٹھتے گئے۔ ایک موٹا سا لڑکا جھومتا جھامتا آیا اور اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا، وہ سمجھ گیا یہ اس کا نیا ساتھی ہے، لیکن اس بات پر اسے حیرت ہوئی کہ آنے والے نے آتے ہی اس کی ایک کتاب اٹھالی اور شرارت بھری آواز میں بولا۔ "واہ بھئی واہ، جلد تو بہت خوبصورت لگوائی ہے، لیکن یہ کچھ مضبوط بھی ہے؟" یہ کہہ کر اس نے جلد کے دونوں گتوں کو دائیں بائیں زور سے کھینچا اور ایسی زور سے کھینچا کہ سلائی کا

دھاگا ٹوٹ گیا۔ جلد کتاب سے الگ ہوگئی۔

امجد کتاب بند کر کے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی کتاب کی یہ حالت دیکھی تو کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ نے کیا کیا؟ جلد اکھاڑ دی کتاب کی!"

"کچھ نہیں۔ دیکھ رہا تھا یہ خوش نما جلد مضبوط بھی ہے یا نہیں لیکن یہ تو بالکل بودی نکلی۔" اس لڑکے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جلد تو کمزور نہ تھی، ہاں آپ نے زور کچھ زیادہ لگا دیا۔" امجد کو اس فضول سے لڑکے کی حرکت پر غصہ آگیا تھا، لیکن اس نے اپنے اوپر قابو رکھا۔

"شاید ایسا ہی ہوا ہو،" اس لڑکے نے یہ کہہ کر امجد کی پنسل اٹھائی اور اس کی نوک ڈیسک پر رکھ کر توڑ دی اور ہنستے ہوئے بولا! "یہ تو آپ کی پنسل بھی بالکل کچی نکلی!"

"اس پنسل کو کچی پنسل ہی کہتے ہیں بھائی، لیکن یہ تو بتایئے آپ میری چیزوں کے پکا اور مضبوط ہونے کا یقین کس خوشی میں کرنا چاہتے ہیں۔ آج ہم پہلی بار ملے ہیں۔ ضروری تو یہ تھا کہ آپ میرا نام پوچھتے اور خوشی ظاہر کرتے کہ میں آپ کا نیا ساتھی ہوں۔" امجد بہت مشکل سے غصے پر قابو پا رہا تھا۔ وہ لڑکا ڈھیٹ بن کر مسکرا رہا تھا، جیسے امجد کو ناراض دیکھ کر اسے خوشی ہو رہی ہو۔ اس نے اب فونٹین پین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن خیریت یہ ہوئی کہ ماسٹر صاحب کمرے میں آگئے اور آتے ہی امجد کی طرف دیکھ کر بولے۔

"تم آگئے امجد بیٹے، ہمیں امید ہے اپنا یہ نیا اسکول تمہیں پسند آئے گا۔ یہاں زیادہ تر شریف گھرانوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ ان کے ساتھ تم ضرور خوش رہو گے۔"

ماسٹر صاحب کی یہ بات سن کر امجد نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ اسے اس میں شریفوں جیسی ایک بات بھی نظر نہ آئی۔ استری کئے بغیر بے ڈھنگا لباس۔ الجھے ہوئے لمبے بالوں سے ڈھکا ہوا ماتھا اور آنکھوں میں شرارت ناچتی ہوئی، اس کا دل چاہا اونچی آواز میں کہے۔ "جناب، یہ دوسری بات تو ٹھیک نہیں ہے اور اگر ٹھیک بھی ہے تو کم سے کم یہ! یہ ساتھی تو ہرگز شریف گھرانے کا نہیں ہے۔" لیکن وہ خاموش رہا۔

ماسٹر صاحب ذرا دیر رک کر بولے، "امجد بیٹے، آج اس اسکول میں تمہارا پہلا دن ہے اور یہ بات ہم تمہیں پہلے دن ہی بتا دینا چاہتے ہیں کہ دیر سے آنے والوں اور کام چور بچوں کو ہم بالکل پسند نہیں کرتے اور صرف ہم ہی کیا، ایسے بچوں کو تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ پسند انہیں کیا جاتا ہے جن کی عادتیں اچھی ہوں اور وہی دنیا میں ترقی بھی کرتے ہیں۔ بیشک تمہارے ابا میاں ہمارے عزیز اور دوست ہیں،

لیکن یہ بات ہم نے انہیں بھی بتادی ہے کہ اگر آپ کا بیٹا محنتی اور شریف ثابت نہ ہوا تو ہم اس کی کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ سمجھ گئے؟"

"جی ماسٹر صاحب" امجد نے بہت ادب سے جواب دیا۔ ماسٹر صاحب نے حاضری کا رجسٹر اٹھالیا اور حاضری لگانے لگے۔ حاضری کے بعد پڑھائی شروع ہوگئی۔ سب بچے کتابوں پر جھک گئے، لیکن امجد نے دیکھا اس کا ساتھی کتاب کی طرف بالکل دھیان نہیں دے رہا۔ وہ کھسک کر اس کے کچھ اور قریب ہوگیا اور آہستہ آواز میں بولا۔ "تو گویا تم ماسٹر صاحب کے کسی دوست کے بیٹے ہو! خیر جو کچھ بھی ہو، لیکن ایک بات ابھی سے سمجھ لو کہ میرے ساتھ کسی طرح کی گڑبڑ نہ کرنا۔ میرا نام اسد ہے اسد، جس کے معنی ہیں شیر، سمجھے!"

"لیکن آپ کی عادتیں تو کچھ بندروں جیسی ہیں۔ نام کا مطلب شیر ہے تو شیروں کی عادتیں بھی سیکھئے۔" امجد نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"میں تو کچھ سیکھوں یا نہ سیکھوں، لیکن تمہیں ضرور بتانا پڑے گا کہ کسی کو بندر کہنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب تم ہشیار رہنا!" وہ غرایا۔

"لیکن میں نے آپ کو بندر نہیں کہا، بلکہ یہ کہا ہے کہ آپ نے اب تک جو حرکتیں کی ہیں ویسی حرکتیں شیر نہیں کرتے۔ میری کتاب کی جلد اکھاڑ دی، پنسل توڑ دی۔" امجد نے سمجھانے کے انداز میں کہا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ اپنے ساتھی کو بندر نہیں کہنا چاہئے تھا۔ "اور اب تمہارا سر توڑوں گا!" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

امجد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا ہٹا کٹا تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی، لیکن وہ اس سے ڈرا نہیں۔ رخ بدل کر اپنا کام کرنے لگا۔ وہ جانتا تھا بدتمیز بزدل ہوتے ہیں۔

دوسرے دن امجد آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا ہوا اسکول آ رہا تھا کہ اسد اچانک اس کے سامنے آگیا۔ سائیکل کا اگلا پہیہ اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا۔ امجد نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن سنبھل نہ سکا۔ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ اس کی کتابیں اور کاپیاں سڑک پر بکھر گئیں اور اس کی ٹانگیں سائیکل کے نیچے دب گئیں۔ اسے سخت تکلیف ہوئی، لیکن وہ ہمت کر کے اٹھا اور اپنی کتابیں اور کاپیاں اکٹھی کرنے لگا۔

سائیکل کا دھکا لگنے سے گرا اسد بھی تھا، لیکن چونکہ اسے پہلے سے اندازہ تھا کہ سائیکل اس سے ٹکرائے گی اس لئے اسے زیادہ چوٹ نہ لگی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور امجد کو زور سے دھکا دے کر بولا۔

"سائیکل پر بیٹھنے کا شوق ہے تو پہلے چلانا سیکھو۔ سمجھے!"

اسد کے دھکا دینے سے امجد پھر زمین پر گر گیا، اسے چوٹ بھی لگی، لیکن وہ ہمت کر کے اٹھا اور بہت اونچی آواز میں بولا۔

"اسد، آخر تم چاہتے کیا ہو؟ ہم ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تک نہیں، کل ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے، پھر میرے دشمن کیوں بن گئے ہو؟"

"اس لئے کہ تم نے مجھے بندر کہا تھا، اب میں تمہیں بندر بن کر مزہ چکھا رہا ہوں۔ لو ایک پنچی اور کھاؤ!" یہ کہہ کر وہ امجد کی طرف بڑھا، لیکن اب امجد مضبوطی سے پیر جما کر کھڑا تھا، جیسے ہی اسد اس کے قریب آیا اس نے اچھل کر اس کے سینے پر لات ماری اور وہ الٹ کر دور جا گرا۔ امجد چھلانگ لگا کر اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی کمر پر ایک اور لات مار کر بولا۔ "خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر تم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو پسلیاں توڑ دوں گا تمہاری، تم جیسے بدتمیزوں کو ٹھیک کرنے کے لئے ہی میں نے جوڈو اور کراٹے کی تعلیم حاصل کی ہے۔"

اسد اٹھ کر امجد پر حملہ کرنے والا تھا، لیکن جوڈو اور کراٹے کی بات سن کر رک گیا۔ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارا جوڈو اور کراٹے تو میں ایسا ٹھیک کروں گا کہ تمہارے ابا جان بھی یاد کریں گے۔ تم جانتے نہیں، تھانے دار کا بیٹا ہوں میں۔ کل ہی تمہارے گھر سے کلاشن کوف برآمد ہوگی اور تمہارا پورا کنبہ حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔ تمہاری اماں جان بھی۔ سمجھے!"

جھگڑا شروع ہونے کے باوجود امجد اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اسد کی زبان سے اپنے ابو اور امی کو حوالات میں بند کرانے کی بات سن کر بے قابو ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ "بدتمیز، میرے ابو اور امی جان کو حوالات میں بند کرانے کی دھمکی دیتا ہے، لیکن یہ نوبت تو اس وقت آئے گی جب تو اپنے پیروں سے چل کر اپنے گھر جائے گا۔ تیرے باپ کی تھانے داری تو میں ابھی نکالے دیتا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا امجد، اسد کی طرف بڑھا۔ غصے سے اس کا منہ لال ہو گیا تھا اور اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ جوڈو اور کراٹے کے جتنے داؤں بھی سیکھے ہیں سب آزمائے گا، لیکن عین اُسی وقت سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی اور اسکول کے وہی ماسٹر صاحب جو امجد کے ابو کے دوست تھے ان کے پاس پہنچ گئے۔ ماسٹر صاحب نے سائیکل سے اترتے ہوئے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ "یہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا لڑ رہے ہو؟ دونوں کی کتابیں سڑک پر بکھری ہوئی ہیں!"

اسد کو اس کی بدتمیزی کی سزا دلوانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا۔ امجد نے ارادہ بھی کیا کہ اصل بات انہیں بتا دے، لیکن پھر کچھ سوچ کر یہ ارادہ بدل دیا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "جی کوئی خاص بات نہیں۔

میں سائیکل سے گر گیا تھا۔"

"چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟" ماسٹر صاحب نے سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔ "دونوں جلدی سے اسکول پہنچو، وقت ہو گیا ہے۔"

چھٹی کے بعد امجد اپنی سائیکل پر بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسد اسی جگہ کھڑا تھا جہاں صبح دونوں کا جھگڑا ہوا تھا۔ اسکول کے پورے وقت میں اس نے کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی جو امجد کو بُری لگتی، لیکن اب اسے یہاں کھڑے ہوئے دیکھا تو خیال کیا یہ ضرور پھر شرارت کرے گا۔ وہ سائیکل سے اتر گیا اور غصے بھری آواز میں بولا۔ "اگر تم یہ نہیں جانتے کہ شرافت بھی کوئی چیز ہے تو آؤ اپنا ارمان پورا کر لو۔ میں تم سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں!"

"نہیں امجد بھائی۔ میں جھگڑا و گڑا کرنے کے لئے یہاں نہیں رکا۔ یہ جاننے کے لئے رکا ہوں کہ جب تم ماسٹر صاحب سے شکایت کر کے مجھے سزا دلوا سکتے تھے تو تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"اس لئے کہ بہادر اپنے دشمنوں سے خود بدلہ لیتے ہیں۔ اپنے ابا جان سے کہہ کر کسی کو حوالات میں بند کرانے کی کوشش نہیں کرتے۔" یہ بات امجد نے مسکراتے ہوئے کہی۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو، لیکن میں اب تم سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟" اسد نے کہا۔

"اور وہ میں بتا چکا ہوں۔" امجد نے یہ کہہ کر آگے بڑھنا چاہا، لیکن اسد نے اس کی سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا اور نرم آواز میں بولا، "دوست جس وقت سے تم نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ ماسٹر صاحب سے میری شکایت نہیں کی، تم مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو، دل چاہتا ہے میں بھی تم جیسا ہی بن جاؤں۔ معلوم ہے اگر تم میری شکایت کر دیتے تو مجھے آج اسکول سے نکال دیا جاتا۔ پہلے بہت سے لڑکے میری شکایتیں کر چکے ہیں اور ماسٹر صاحب نے کہہ دیا تھا کہ اگر اب تمہاری کوئی شکایت مجھ تک پہنچی تو تمہارا نام خارج کر دوں گا۔"

"تو پھر تم ایسی حرکتیں کرنے سے رکے کیوں نہیں جن کی وجہ سے لڑکے تمہاری شکایت کرتے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ شرارتوں میں کچھ اور تیز ہو گئے ہو۔ یاد کرو تم نے کیسی غلط حرکتیں کی تھیں میرے ساتھ!" امجد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"میں خود نہیں سمجھتا کہ ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہوں۔ لیکن اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" اسد شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

امجد ہنستے ہوئے بولا۔ "اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آج تمہاری کسی قدر پٹائی ہو گئی۔ تم تو

میرے بارے میں یہی سمجھ رہے ہوگے کہ اٹھا کر زمین پر پٹخ دوں گا؟"

"نہیں، اس وجہ سے نہیں، بلکہ تمہارے اس اچھے سلوک کی وجہ سے کہ تم مجھے سزا دلوا سکتے تھے، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ رہی ڈرنے کی بات تو یہ بالکل نہیں ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔" اسد نے سینہ تان کر کہا۔

"اور شاید اس لئے نہیں ڈرتے کہ تمہارے ابا جان پولیس میں تھانے دار ہیں؟" اسد کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ تھی۔ "لیکن یہ سن کر مجھ سے ضرور ڈرنے لگو گے کہ میرے ابا جان ڈی ایس پی ہیں جانتے ہو ڈی ایس پی کون ہوتا ہے؟"

"اچھا چھوڑو یہ ڈرنے ڈرانے کی بات، یہ بتاؤ تم مجھ اپنا دوست بنانا پسند کرو گے؟ معلوم نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا دوست بن جاؤں۔ تم مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو۔" اسد نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"یہ بات سن کر امجد کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "کیوں نہیں۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست بن سکتے ہیں، لیکن اس کے لئے یہ شرط ہے کہ تم اس وقت سے اپنی عادتیں بدلنے کی کوشش شروع کر دو۔ اور اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ اپنی شکل صورت ٹھیک کرو۔ یہ جو تم نے الجھے ہوئے اور ماتھے پر پھیلے ہوئے بالوں کا بوجھ سر پر اٹھا رکھا ہے، نائی سے انہیں ٹھیک کراؤ۔ اس تنگ موٹی پتلون کی جگہ شریف مسلمان بچوں کا لباس پہنو۔ بولو ہے منظور؟"

"بالکل منظور ہے۔ لاؤ ہاتھ۔ اگر تم یقین کرو تو میں نے پہلے ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ ہر بات میں بالکل تم جیسا بننے کی کوشش کروں گا۔ جوڈو اور کراٹے بھی سیکھوں گا۔" اسد نے یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

"نا بابا نا!" امجد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر تو تم اور بھی خطرناک بن جاؤ گے۔ بیشک جوڈو سیکھنے کے بہت سے فائدے ہیں، لیکن ان سے پہلے یہ سیکھنا ضروری ہے کہ اگر کسی بات پر غصہ آئے تو آدمی غصے پر قابو پالے۔ اچھل کر کسی کے سینے پر لات نہ مار دے، اس کے علاوہ اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ انصاف کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے اور اللہ پاک سے پکا وعدہ کیا جائے کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ضرور حصہ لوں گا اور برائی کے کسی کام میں شامل نہ ہوں گا۔"

"میں یہ وعدہ بھی کرتا ہوں۔" اسد نے یقین دلایا۔

"تو پھر ہم پکے دوست بن گئے۔" امجد نے بہت خوش ہو کر کہا اور آگے بڑھ کر اسد کو گلے لگا لیا۔ وہ دونوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔

آنکھ مچولی البم

زاویۂ نظر کیا بدلا، منظر بدل گئے!

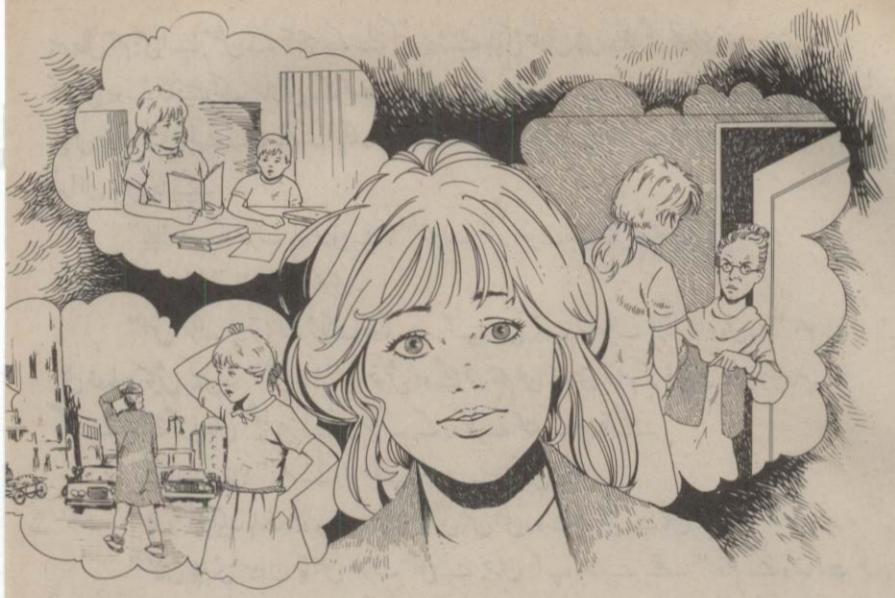

نیکی کر بھلا ہو گا

نائلہ صدیقی

کل اچانک جب ہم نے اپنی زندگی کا سرسری جائزہ لیا تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ پیدائش سے لے کر اب تک ہم صرف اپنے لئے جی رہے ہیں اور "اوروں" کے کام آنے کی کبھی کوئی معقول یا نامعقول کوشش نہیں کی۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے طے کر لیا کہ اب بقیہ تمام زندگی دوسروں کے کام آنے کے سوا کوئی کام نہیں کریں گے۔ لہٰذا صبح سے ہم ان "اوروں" کی تلاش میں تھے جن کے کام آکر ہم زندگی کا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ اصل میں یہ خیال ہمیں ایک مضمون پڑھ کر آیا جس میں مضمون نگار نے دوسروں کے ساتھ نیکی کی تلقین کی تھی اور ساتھ ہی اپنی مثال دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے تین چار بار ایک بوڑھے بابا کو سڑک پار کروائی تھا۔ (پتہ نہیں وہ "بابا" بار بار سڑک کے پار جا کر کیا کرتا تھا؟)

بہرحال ہم بھی اپنے مشن کے آغاز کے لئے کسی بوڑھے بابا کی تلاش میں نکلے مگر تھوڑی ہی دیر میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک سازش کے تحت سڑکوں پر بزرگ افراد کی آمد و رفت بند کر دی گئی ہے۔ ہم مایوس ہو کر واپس پلٹ رہے تھے کہ اچانک چونک اٹھے ایک بابا سڑک کے کنارے اداس کھڑے تھے، ہم فوراً ان پاس جا پہنچے۔

"بابا! آپ کو سڑک پار کرنی ہے؟" ہم نے شہد بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" بابا نے آہ بھری۔

"اس سڑک پر تو بہت ٹریفک ہوتا ہے، آیئے میں آپ کو سڑک پار کروا دوں۔" ہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ "شکریہ!" بابا خوش ہوگئے اور ہم ان کا ہاتھ تھام کر ٹریفک کے اژدھام سے گزرتے ہوئے گویا جان ہتھیلی پر رکھ کر سڑک کے دوسرے کنارے پر آ گئے۔

"ٹھیک ہے بابا؟" ہم نے داد طلب نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں! مگر ایک بات بتاؤ یہ جی سیون نمبر کی بس اسی روٹ پر آتی ہے ناں؟"

"نہیں بابا جی سیون تو اس طرف آتی ہے جہاں آپ کھڑے تھے۔" ہم نے وضاحت کی۔

"کیا جی سیون اس طرف آتی ہے؟ ارے نالائق تو مجھے یہاں کیوں لے آئیں، مجھے تو جی سیون پر جانا ہے۔" ہم ششدر رہ گئے۔ اتنے میں بابا کی آواز پھر ہماری سماعت سے ٹکرائی۔

"اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو مجھے دوبارہ سڑک پار کرواؤ۔"

"دوبارہ؟" ہم نے سڑک پر ٹریفک کے سیل رواں کو دیکھا اور سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گھر آکر تھوڑی دیر تک سانس بحال کرنے کے بعد دوبارہ مضمون کے مطالعے میں غرق ہوگئے کیونکہ سڑک پار کروانے والی نیکی بڑی طرح فلاپ ہو چکی تھی۔

"بیمار کی عیادت، اظہار ہمدردی کا سب سے مؤثر طریقہ ہے۔" یہ جملہ پڑھ کر ہم خوشی سے اچھل پڑے کیونکہ ہمارے محلے میں ایک عدد "بیمار آنٹی" موجود تھیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم نے فٹافٹ سوپ تیار کیا اور آنٹی کے گھر چل پڑے۔

"ہنہ بیماری میں بھی چین نہیں لینے دیتے یہ محلے والے۔" بیل کے جواب میں آنٹی بڑبڑاتی ہوئیں گیٹ پر آئیں۔ دراصل جلنا کڑھنا ان کا پارٹ ٹائم جاب تھا اور ان کے کوسنے وغیرہ اکثر ان کے گھر سے ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے تھے۔

"دیکھئے آنٹی! میں آپ کے لئے سوپ بنا کر لائی ہوں۔"

"اچھا! اندر آجاؤ۔" آنٹی کے رویئے میں واضح تبدیلی آئی۔ ہم نے اندر جاتے ہی سوپ ان کی خدمت میں پیش کیا۔

"ارے کیا یہ سوپ ہاتھ سے بنایا ہے؟" انہوں نے پہلا گھونٹ لیتے ہی ایک اشتعال انگیز بیان جاری کیا، جس کے نتیجے میں ہم نے باہر کی راہ لی ہی تھی کہ پیچھے سے آنٹی کی آواز آئی۔

"ذرا مجھے ایک کلو بکری کا گوشت لادو۔" ہم سراپا خدمت بن گئے اور گوشت والے کی دکان پر جا کھڑے ہوئے۔ گوشت والے نے خاصی دیر بعد مکھیوں کے ہجوم میں سے گوشت برآمد کرکے ہمارے حوالے کیا جس کا وزن ہڈیوں اور مکھیوں سمیت ایک کلو بنتا تھا۔ ہم نے یہ گوشت آنٹی کی خدمت میں پیش کیا۔

"ارے اس میں تو اتنی ہڈیاں ہیں۔" انہوں نے حسب عادت تنک کر کہا۔

"یہ ہڈیاں بھی بکرے کی ہیں، ہماری نہیں۔" ہم نے بھی جل کر کہا اور جذبۂ ہمدردی پر فاتحہ پڑھ کر گھر آگئے۔

"علم کی روشنی پھیلانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ ہماری چھوٹی بہن کتاب کھلے رٹا لگانے میں مصروف تھی اس کا یہ جملہ سن کر ہمارا جذبۂ ہمدردی ایک دفعہ پھر ابھر آیا۔ اب ہم نیکی کا یہ موقع کھونا نہیں چاہتے تھے چنانچہ نگاہِ انتخاب اس سلسلے میں ماسی کی لختِ جگر پر پڑی لہٰذا ہم نے سب سے پہلے ماسی کے بچے کو ایک عدد صابن اور ایک جوڑا کپڑا عنایت کیا کہ کل سے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر آنا، ہم تمہیں پڑھایا کریں گے۔" مگر ہماری ماسی جو ایامِ جاہلیت کی پیداوار تھی، یہ سنتے ہی بھڑک اٹھی۔

"ناجی نہ! میرے بچے کا مستقبل نہ کھراب کرو، کوئی جرورت نہیں پڑھانے لکھانے کی، چل رے۔" وہ اپنے بچے کو گھسیٹ کر بولی۔ بچہ جو ابھی سوٹ اور صابن لیتے وقت ننھے فرشتے کی طرح مسکرا رہا تھا اچانک شیطان بن گیا، ہمیں منہ چڑا کر، سوٹ بغل میں دبا کر ماسی کے ساتھ چلتا بنا۔ جاتے وقت اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔ ہم غم و غصے سے بلبلا اٹھے۔ "پہلے پڑھائی کی شرط لگانی تھی پھر سوٹ دینا چاہئے تھا۔ یہ کیسی حماقت ہوئی ہم سے!" ہم اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے۔ یہ غصہ اس وقت ٹھنڈا ہوا جب ایک دن سامنے والی باجی نے کھڑکی سے لٹک کر فرمائش کی۔ "تم میرے شانی کو پڑھا دوگی، شام کے وقت دو گھنٹے؟" علم کی روشنی پھیلانا ہو تو ہم کیسے انکار کرسکتے تھے، اتنی بڑی نیکی سے منہ موڑنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا لیکن شانی کو پڑھانے کی حامی بھر کے ہم بہت فکر مند تھے کیونکہ شانی صاحب میلوں دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور اُن کے ارد گرد علم کی روشنی پھیلانا خاصا دشوار کام تھا۔

"دیکھو اسے پیار سے پڑھانا۔" شانی کی والدہ صاحبہ نے ایک اور فرمائش کی۔

"جی ہم اسے مار سے پڑھا بھی نہیں سکتے کیونکہ ہمارے گھر کوئی توپ گاڑی نہیں جس سے اسے مارا جائے اور اسکیل وغیرہ سے تو یہ مرے گا نہیں، مطلب پٹے گا نہیں۔" ہم نے دل ہی دل میں وضاحت کی۔ شام کو شانی صاحب تشریف لائے تو ہم نے انہیں کتاب کھولنے کا آرڈر دیا۔

"ہاں بتاؤ! الف سے؟" ہم نے اس کی سابقہ معلومات چیک کرنا چاہا۔

"اُلّو۔" اس نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا؟؟" ہم پوری قوت سے چیخے مگر اس نے کوئی نوٹس نہ لیا اور "ربر" منہ میں ڈال کر چبانے لگا۔

"یہ ربر گھر جاکر کھالینا، یہاں تم پڑھنے آئے ہو۔" ہم نے اسے جھڑکا۔

"ہاں ہاں ہاں۔" ایک ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی۔ ہم نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر دور دور تک کسی اور ہاتھی کا پتہ نہ تھا، یہ چیخ شانی کے منہ سے نکلی تھی اور برقی لہروں پر سفر کرتی کھڑکی سے لٹکتی ماں کے کانوں تک پہنچ گئی، دوسرے ہی لمحے ماں بمعہ ممتا ہمارے گھر میں موجود تھیں۔

"یہ مجھے ڈانٹتی ہے۔" شانی نے چلّا کر فریاد کی۔"

"یہ ربر کھا رہا تھا، میں نے منع کیا تو....." ہم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"تو کھانے دیتیں ناں، یہ تو سستا والا ربر ہے، اصل میں یہ بیچارہ غذائی کمی کا شکار ہے۔ اس لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہے۔" والدہ نے سائنٹفک توجیہہ پیش کی۔

"ہوں! غذائی کمی کا شکار تو ضرور ہے مگر یہ نہیں ہے ہمارا ملک ہے اور وہ بھی آپ کے بیٹے کی وجہ سے۔" ہم نے دل ہی دل میں ان کی تصحیح کی۔ وہ اپنے بیٹے کو گھسیٹتی ہوئی چلی گئیں اور اس کے ساتھ ہی ہمارا نیکی کا پیریڈ ختم ہوگیا۔ چنانچہ ہم سخت اداس بیٹھے تھے۔ "کیا ہوا بھئی؟" ابو کی آواز سن کر ہم جو بھرے بیٹھے تھے، فوراً الف سے ی تک ساری داستان کہہ سنائی۔

"غلطی تمہاری ہے۔" ہماری داستانِ الم سن کر ابو نے کہا۔ "تم نے نیکی کے تصور کو اتنا محدود کیوں کر لیا ہے، بھوکے کو کھانا کھلا دینا یا کسی کو سڑک پار کروا دینا ہی ہمدردی اور نیکی ہے؟ کیا نیکی گھر کے اندر نہیں کی جاسکتی، والدین کی ذمہ داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانا، چھوٹے بہن بھائیوں سے شفقت سے پیش آنا، پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، مہمانوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا بھی تو نیکی ہے اور سب سے بڑی نیکی تو یہ ہے کہ تمہارے منہ سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو کسی کی دل آزاری کا باعث بنے۔ اور....." اب ہم بہت مطمئن اور خوش ہیں کیونکہ ہم نے نیکی اور ہمدردی کا صحیح مفہوم سمجھ لیا ہے اور "اوروں" کے کام آنے کا سلیقہ بھی سیکھ لیا ہے۔

ان سیاروں پر کون سی مخلوق آباد ہے؟

عشرت رضیہ

یہ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے کہ ایک چینی سائنس دان کو چین کے سرحدی علاقے کی پہاڑیوں سے عجیب و غریب قسم کی پلیٹیں ملیں۔ یہ پلیٹیں گرام فون کے ریکارڈ سے ملتی جلتی تھیں ہر پلیٹ کے درمیان میں بڑا سا سوراخ تھا جس کے ارد گرد عجیب سے نشانات موجود تھے۔ جو کسی نامعلوم زبان کے الفاظ لگتے تھے۔ یہ پلیٹیں ہزاروں سال پرانی تھیں۔ وہ سائنس دان کئی سال تک ان پلیٹوں پر تجربات کرتا رہا۔ اور ان تجربات کے حیرت انگیز نتائج نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ پلیٹیں کم از کم ہماری دنیا سے تعلق نہیں رکھتیں۔ ان پلیٹوں کا بنیادی عنصر کوبالٹ تھا جو ہماری دنیا میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ یہ دھات دریافت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا خصوصاً جس زمانے سے یہ پلیٹیں تعلق رکھتی ہیں اس دور میں تو کوئی بھی اس دھات کے بارے میں جانتا تک نہیں تھا

برقی تجربات کے دوران یہ پلیٹیں خاص انداز میں تھرتھراتی تھیں اس تھرتھراہٹ کو ریکارڈ کرنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ تھرتھراہٹ کوئی خاص قسم کا پیغام ہے جو کہ سائنس دانوں کی سمجھ سے بالا تر تھا۔

تجربات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ پلیٹیں کسی الیکٹرک سرکٹ کا حصہ ہیں لیکن تجربہ گاہ میں موجود

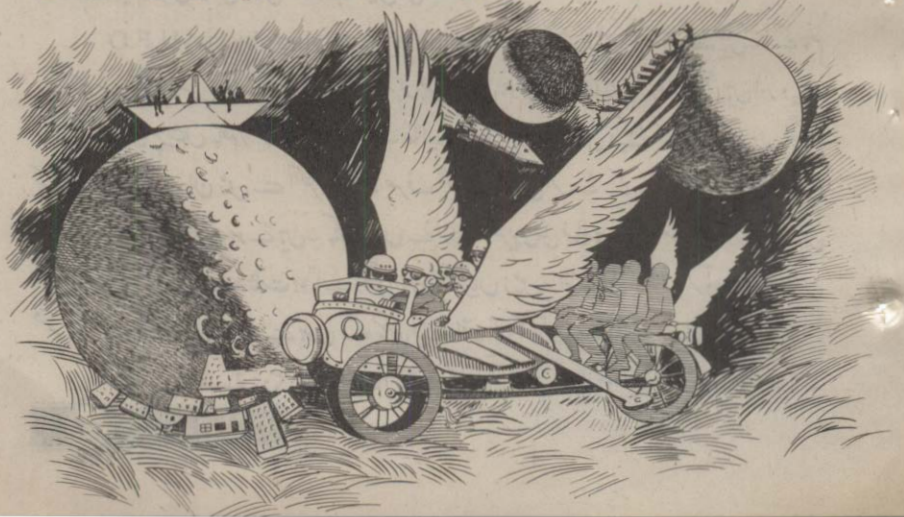

الیکٹرک سرکٹ سے یہ زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں لگتا تھا کہ یہ کسی اور برقی سرکٹ کا حصہ ہیں۔ جو کہ ہماری دنیا میں موجود نہیں بلکہ کسی اور دنیا میں موجود ہیں اسی دنیا میں جہاں سے یہ پلیٹیں آئی ہیں۔

اسی طرح کئی سال پہلے وسطی چین میں ایک قبر دریافت ہوئی جس سے ایک عجیب و غریب قسم کا ڈھانچہ بر آمد ہوا۔ جس کا سر بہت بڑا اور جسم اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور دبلا پتلا تھا۔ یہ قبر ہزاروں سال پرانی تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ اس کی دیواروں پر سورج اور تاروں وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کے درمیان چھوٹے چھوٹے نقطے بھی موجود تھے۔ جب انہیں مائکرو سکوپ کے ذریعے دیکھا گیا تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ یہ نقطے دراصل خلا سے لی گئی زمین کی تصویریں تھیں اس دور میں جب کہ انسانی زندگی غاروں اور گھاس پھوس کی جھونپڑیوں تک محدود تھی یہ تصویریں کسی صورت میں بھی انسانی ہاتھ کی تخلیق نہیں ہو سکتیں۔

ان دونوں واقعات اور چند اور شواہد کی بنا پر سائنس دان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ آج سے ہزاروں سال پہلے اس زمین پر بیرونی خلا سے کوئی مخلوق اتری تھی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ پلیٹیں اور قبر کے اندر موجود ڈھانچہ اور تصویریں کہاں سے آئیں؟۔ اس سوال کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ہزاروں سال پہلے کوئی اور مخلوق زمین پر اتری تھی، تو کیا وہ دوبارہ زمین پر اترنے کی کوشش نہیں کرے گی؟ اگر ہم موجودہ زمانے میں پیش آنے والے کچھ حیرت انگیز واقعات کا جائزہ لیں تو اس سوال کا جواب ہمیں مل جائے گا۔

U.F.O یا Unidentified flying objects جسے اردو میں اڑن طشتری کہتے ہیں۔ کے نام سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ وہ پراسرار چیزیں ہیں جو اچانک فضا میں نمودار ہوتی ہیں اور دیکھنے والوں کو حیران پریشان چھوڑ کر اسی طرح اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ انہیں دیکھنے کا دعویٰ ہزاروں لوگ کر چکے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر دعوے صرف شہرت حاصل کرنے کے لئے کئے گئے پھر بھی کئی دعوے درست بھی ثابت ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اڑن طشتریوں کی نہایت واضح تصویریں اور وڈیو فلمیں بھی پیش کیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے واقعی اڑن طشتریاں زمین پر اترنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں اس قسم کے کئی واقعات آپ نے سنے ہوں گے لیکن ایک واقعہ کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔

سائبیریا کے علاقے تنگسکا میں ۱۵ میل کے علاقے میں پھیلا ہوا ایک جنگل ہوا کرتا تھا۔ یہ

۱۹۰۸ء کی ایک چمکیلی صبح تھی جب فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے کئی ٹن وزنی کوئی چیز لڑھکتی ہوئی آئی اور جنگل سے تقریباً ۱۰۰ میل اوپر فضا میں زور دار دھماکے سے پھٹ گئی۔ دھماکہ اتنا زبردست تھا کہ اس کی آواز اور اس سے پیدا ہونے والے زلزلے کی لہریں کئی ممالک میں ریکارڈ کی گئیں۔ اس دھماکے پر فوری طور پر زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی کیونکہ ایک تو یہ دھماکہ بہت دور دراز علاقے میں ہوا تھا اور دوسرے کچھ ہی عرصے بعد جنگ عظیم شروع ہوگئی جس کی وجہ سے یہ واقعہ پس منظر میں چلا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۷ء میں سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے اس جگہ کا معائنہ کیا اور اس دھماکے کو شہاب ثاقب کا نام دے کر دنیا کو مطمئن کر دیا۔ (اور اکثر لوگ اب بھی اسے شہاب ثاقب کا واقعہ سمجھتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔)

لیکن اس کے چند سالوں بعد ایک روسی سائنس دان الیگزنڈر کازن ٹسو نے اس علاقے کا دوبارہ دورہ کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس علاقے میں شہابیے کا کوئی بھی گڑھا موجود نہیں تھا۔ جب کہ اتنا بڑا شہابیہ گرنے پر میلوں لمبا اور گہرا گڑھا پڑ جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دھماکے کے اثرات بہت خوفناک تھے۔ سارا جنگل بھسم ہوچکا تھا۔ یہاں تک کہ کائی (Moss) بھی جھلس گئی تھی۔ میلوں کے علاقے میں موجود تمام جاندار ختم ہوگئے تھے۔ سوائے دو اشخاص کے جو خوش قسمتی سے بچ گئے تھے۔ کازن ٹسو نے ان کے بیانات لئے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے یہ دھماکہ محفوظ مقامات سے دیکھا تھا ان کے بیانات بھی لئے گئے۔ ان تمام بیانات اور چند اور حقائق اور تجربات کے بعد کازن ٹسو پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ۱۹۰۸ء میں ہونے والا یہ دھماکہ کوئی عام دھماکہ نہیں تھا بلکہ ایک ایٹمی دھماکہ تھا۔ اس بات کے حق میں اسے کئی شواہد ملے۔ ایک تو وہ مخصوص مشروم نما بادل کا مرغولہ جو صرف ایٹمی دھماکے سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مقام پر دھماکہ ہوا تھا اس کے عین نیچے موجود درختوں کی چوٹیاں اڑ گئی تھیں۔ جب کہ تنے کوئلے کی صورت میں سالم حالت میں موجود تھے یہ صرف ایٹمی دھماکے سے ممکن ہے۔ تیسرے یہ کہ دھماکے کے چند سالوں بعد ارد گرد کے علاقوں میں بسنے والے کچھ لوگ عجیب و غریب بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ ان کے ڈھانچوں پر کئے گئے تجربات سے معلوم ہوا کہ یہ بیماریاں تابکاری اثرات سے پیدا ہوئی تھیں۔

اس حقیقت کے انکشاف کے بعد کازن ٹسو نے اس علاقے کی کھدائی کروائی اور اس پھٹنے والی چیز کے چند ٹکڑے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تجربات پر معلوم ہوا کہ یہ ٹکڑے ایسی دھاتوں پر مشتمل ہیں جو کہ کسی بھی شہاب ثاقب میں نہیں پائی جاتیں۔ اس کے علاوہ چند مصنوعی بھرتیں بھی ان کا حصہ تھیں

جو ظاہر ہے کہ کسی بھی اجرام فلکی کا حصہ نہیں ہو سکتی۔

ان نتائج نے سائنس دانوں کو چکرا کر رکھ دیا۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ۱۹۰۸ء میں سائبیریا کے اس علاقے میں کسی خلائی جہاز نے اترنے کی کوشش کی تھی جو کہ ایٹمی ایندھن سے چلتا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے اس کا ایٹمی انجن پھٹ گیا اور وہ زمین پر اترنے سے پہلے ہی تباہ ہوگیا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دور خلاؤں میں کسی اور سیارے پر بھی زندگی موجود ہے۔ جو ہمارے سیارے پر اترنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس ضمن میں تازہ ترین واقعہ آسٹریلیا کی رصد گاہ میں موصول ہونے والے پراسرار سگنل ہیں جو کسی اور دنیا سے بھیجے جارہے ہیں۔ آسٹریلوی سائنس دانوں نے ان سگنلز کا جواب بھیج دیا ہے۔ اب دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اگر ہم اسلامی نظریئے سے اس بات کا جائزہ لیں تو قرآن میں کئی جگہوں پر سات آسمانوں کا ذکر آیا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زمین کے علاوہ کائنات میں چھ اور سیاروں پر زندگی موجود ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں ارشاد ہے "اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔" رحمت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات پر کرتا ہے۔ اور اس آیت میں جہان نہیں بلکہ "جہانوں" کا ذکر ہے جس کا مطلب ہے اور بھی جہان ہیں جہاں خدا کی مخلوقات بستی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا پیغام وہاں بھی پہنچ چکا ہے یا آئندہ پہنچے گا۔

بہر حال اگر اس نظریئے میں کوئی صداقت ہے اور کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والی کوئی مخلوق دوستی کی نیت سے ہماری زمین پر اترنے کی کوشش کر رہی ہے تو ہم اسے خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ وہ ہم انسانوں کی سلامتی کے لئے خطرہ ثابت نہ ہوں۔

اچھا پڑوس

کسی خاتون نے اپنا کرائے کا مکان چھوڑا اور دوسرے محلے میں جا کر رہنے لگیں۔ چند دن بعد وہ اپنی پرانی پڑوسن سے ملنے گئیں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگیں۔

"ہمیں پڑوس بہت اچھا ملا ہے۔"

یہ سن کر پرانی پڑوسن بولی۔

"اللہ کا شکر ہے بہن، اب ہمیں بھی اچھا پڑوس مل گیا ہے۔" شیخ عامر فیاض، قصور

عید آئی

ضیاء الحسن ضیاء

آہا، لو عید آئی
سب نے خوشی منائی
وہ دیکھو ننھے منے
کپڑے ہیں اچھے پہنے
دادا کی انگلی تھامے
مُنّو بھی گھر سے نکلے
بوڑھے، جوان، بچے
خوش ہو رہے ہیں کیسے
آپس میں مل رہے ہیں
چہرے بھی کھل رہے ہیں
ہر اک دکاں سجی ہے
ہر چیز بِک رہی ہے
میلا لگا ہوا ہے
اِک غُل مچا ہوا ہے

کتے بھی اب کھیلتے ہیں فرزبی

ش، م، خالد

پطرس بخاری نے اپنے مضمون "کتے" میں کتوں کی بہت سی اقسام بیان کی ہیں۔ لیکن وہ اپنے مضمون میں کتوں کی ایک قسم کے متعلق کچھ نہ لکھ سکے تھے کیونکہ جس وقت انہوں نے یہ مضمون لکھا تھا اس وقت تک کتوں کی یہ قسم متعارف نہیں ہوئی تھی۔ کتوں کی یہ قسم کھلاڑی کتوں کی ہے۔ یہ قسم فی الحال صرف چند ممالک میں موجود ہے۔ ان کھلاڑی کتوں کے درمیان مختلف کھیلوں کے مقابلے بھی ہوتے ہیں ان مقابلوں میں سے ایک مقابلہ فرزبی چیمپئن شپ کا بھی ہے۔

کتوں کی فرزبی چیمپئن شپ ہر سال موسم بہار میں جب امریکہ میں انسانوں کے درمیان فرزبی کے عالمی مقابلے منعقد ہوتے ہیں تو اس وقت کتوں کے مقابلے بھی منعقد ہوتے ہیں ان مقابلوں میں دنیا بھر سے کھلاڑی کتے حصہ لیتے ہیں۔

اس سال بھی یہ مقابلے واشنگٹن (امریکہ) میں منعقد ہوئے اور ان مقابلوں میں دنیا کے منجھے ہوئے ۱۳ کتوں نے حصہ لیا اور اپنے کھیل سے انسانوں کو بے حد متاثر کیا، ان مقابلوں کو ہزاروں افراد نے دیکھا۔

فرزبی چیمپئن شپ کے دو حصے ہوتے ہیں، پہلے حصے میں فرزبی کو ۲۰ سے ۴۰ گز دور پھینکا جاتا ہے کتا اس فرزبی کو ایک منٹ کے اندر جتنی مرتبہ کیچ کر کے واپس لاتا ہے اسے اتنے ہی پوائنٹ دیئے جاتے ہیں، دوسرے حصے میں فرزبی کو مختلف انداز میں اونچا اچھالا جاتا ہے۔ کھلاڑی کتا فرزبی کو انتہائی تیزی اور پھرتی سے کیچ کر کے واپس اپنے مالک کے پاس لاتا ہے۔

یہ اولمپک کے کتوں کی

کتوں کی فرزبی چیمپئن شپ کے چند خوبصورت مناظر

Montgomery

The Height of Delight!

طاہر مسعود

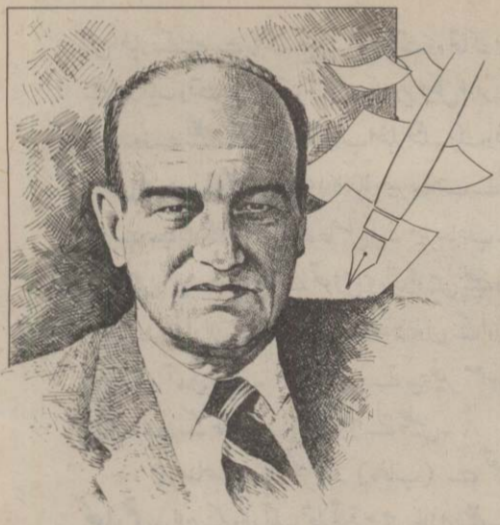

میر صحافت

ہم لوگ جب کسی بڑے آدمی کو دیکھتے ہیں تو کچھ ایسا دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ ہمیشہ سے بڑے تھے۔ ہم ان کی زندگی پر نظر نہیں ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کے بڑا بننے کے لئے اور ایک اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے انہیں کتنی جدوجہد کرنی پڑی۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے اکثر بڑے لوگ بہت معمولی گھرانوں میں پیدا ہوئے لیکن پھر انہوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد بنایا اور اس مقصد کو پانے کے لئے اپنی ساری عمر کھپادی، تب جا کے وہ بڑے آدمی کہلائے۔ کیوں کہ بڑا وہی ہوتا ہے جو بڑا کارنامہ انجام دے اور بڑا کام کرنے کے لئے بڑے گھر میں پیدا ہونا قطعی ضروری نہیں۔

نئے سال کے آغاز پہ ہمارے ملک کے ایک انتہائی اہم آدمی کا انتقال ہوگیا۔ وہ پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اخبار روزنامہ "جنگ" کے ایڈیٹر انچیف تھے۔ یوں تو ان کا نام میر خلیل الرحمٰن تھا لیکن لوگ انہیں میر صاحب کہا کرتے تھے۔ اس مضمون میں بھی ہم انہیں میر صاحب ہی لکھیں گے۔ میر صاحب ایک بے انتہا محنتی اور مستعد انسان تھے، ان کی زندگی میں بہت سی باتیں ہم سب کے سیکھنے اور سمجھنے کی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت نچلے درجے سے اپنا صحافتی سفر شروع کیا اور دن رات محنت کر کے اپنے اخبار کو اردو صحافت کی تاریخ کا سب سے بڑا اخبار بنا دیا۔ ان کے اخبار میں دوسری بہت سی خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ آج جہاں جہاں اردو زبان بولی یا پڑھی جاتی ہے وہاں وہاں روزنامہ "جنگ" پڑھا جاتا ہے یا کم سے کم لوگ

اس اخبار کے نام سے واقف ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ میر صاحب خود اپنا اخبار سائیکل پر رکھ کر بیچا کرتے تھے اور ایک وقت یہ بھی آیا کہ ان کے دیو ہیکل ادارے سے انگریزی اور اردو کے تین اخبارات اور دو ہفت روزے نکلنے لگے۔ ان کا محبوب اخبار جنگ بیک وقت پانچ شہروں میں چھپنے لگا اور خود ان کا شمار سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔ یہ ساری کامیابی میر صاحب نے مسلسل اور انتھک محنت، کاروباری ذہانت اور اپنے کام سے بے پناہ لگاؤ کے ذریعے حاصل کی۔ میر صاحب نے جب اپنے اخبار کا ڈول ڈالا تھا تو شاید انہوں نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کے تھوڑی سی تعداد میں چھپنے والا یہ اخبار ایک دن دس لاکھ کی تعداد میں چھپنے لگے گا، ہزاروں افراد ان کے ادارے سے وابستہ ہوں گے اور صرف ایک دن کے اخبار کی اشاعت سے لاکھوں روپوں کی آمدنی ہوگی۔ میر صاحب نے یہ غیر معمولی کامیابی کیسے حاصل کی؟ آیئے اس کے لئے ان کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالتے چلیں۔

میر صاحب نے گجرانوالہ (پنجاب) سے تعلق رکھنے والے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے والد ایک تجارتی فرم میں ملازم تھے۔ میر صاحب نے دہلی کے فتح مسلم ہائی اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تجارت کے پیشے میں جائے اور روپے پیسے کمائے۔ اس لئے میر صاحب نے گریجویشن کرنے کے لئے کمرشل کالج دہلی میں داخلہ لیا اور ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ سیکھی۔ کالج سے میگزین نکلا تو اس کے اردو سیکشن کی ادارت میر صاحب کو مل گئی۔ کالج میگزین کی ادارت کے کام میں انہیں بے حد لطف آیا اور یہیں سے ان میں صحافت کے پیشے سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

یہ ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے۔ دہلی میں ایک صاحب تھے دادا عشرت علی، وہ ایک ہفتہ روزہ اخبار "نگار خانہ" نکالتے تھے۔ میر صاحب کچھ عرصہ اسی اخبار سے وابستہ رہے۔ بلکہ خود ان کا بیان یہ ہے کہ داد عشرت علی ان سے انگریزی میں کاروباری خط و کتابت کرایا کرتے تھے جس سے انہیں اس کام میں مہارت حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں میر صاحب نے دادا عشرت علی کے تعاون سے شام کا ایک اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اخبار کا نام کیا رکھا جائے۔ چونکہ اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اس لئے میر صاحب نے اس کا نام روزنامہ "جنگ" تجویز کیا۔ اخبار نکلا تو اس کی قیمت ایک پیسہ تھی۔ یہ چھوٹے سائز کے صفحے پر چھپتا تھا۔ ان دنوں میر صاحب کی عمر مشکل سے اٹھارہ انیس سال کی رہی ہوگی۔ اخبار جب چھپ جاتا تھا تو میر صاحب سائیکل پہ رکھ کر اسے بیچنے نکلتے تھے۔ دلی میں مسلمانوں کے دو ہی اخبار تھے۔ روزنامہ "ڈان" جو انگریزی کا اخبار تھا اور دوسرا روزنامہ "انجام"۔ باقی پورا پریس مسلمانوں کے خلاف تھا۔ "انجام" مسلم لیگ کا ترجمان تھا اور اس کی اشاعت بھی زیادہ تھی۔ جب پاکستان کی

تحریک اپنے عروج پر پہنچی تو میر صاحب نے بھی "جنگ" کو مسلم لیگ کا حامی اخبار بنا دیا۔ اسی زمانے میں میر صاحب نے انگریز حکومت کے خلاف کوئی سخت تحریر لکھ دی جس پر انہیں ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار بھی کیا گیا۔

پاکستان وجود میں آیا تو میر صاحب کراچی ہجرت کر آئے۔ آتے ہوئے انہوں نے اپنے سسر سلطان صاحب سے پانچ ہزار روپے قرض لئے۔ چند سو روپے تو رستے ہی میں خرچ ہوگئے باقی رقم انہوں نے بنک میں محفوظ کر دی۔ ہندوستان سے آتے ہوئے رستے میں ان کی ملاقات ایک صحافی غازی انعام نبی پردیسی سے ہوئی۔ ان سے بات چیت میں یہ پروگرام طے پایا کہ جنگ دلی اور کراچی دونوں شہروں سے ایک ساتھ نکالا جائے۔ کراچی سے "جنگ" جاری کر کے اس کی ادارت غازی انعام نبی پردیسی کے سپرد کر کے میر صاحب خود دلی چلے گئے تاکہ وہاں سے "جنگ" نکالنے کا مستقل بندوبست کریں۔ وہاں سے پرچہ نکلا بھی لیکن چل نہیں سکا۔ کیوں کہ ہندوستانی حکومت نے اسے بند کر دیا۔

کراچی جنگ کا پہلا شمارہ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو نکلا۔ ان دنوں میر صاحب کے اخبار کا دفتر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ وہ صبح سویرے آکر دفتر میں خود ہی جھاڑو دیتے، مٹی اڑا اڑا کر میز اور کرسیوں پر جم جاتی، جسے وہ میلے کپڑے سے صاف کرتے۔ دفتر کی صفائی کے بعد وہ بیٹھ کر خبروں کا ترجمہ کرتے اور انہیں کاتب کے حوالے کر دیتے تھے۔ اخبار کی کتابت مکمل ہو جاتی تو پھر مسئلہ یہ درپیش ہوتا تھا کہ اس کو چھاپنے کے لئے کاغذ وغیرہ کے پیسے کہاں سے لائیں۔ اس کا طریقہ یہ نکالا کہ جو ہاکر اخبار کا آرڈر بک کرانے آتے ان سے پیشگی رقم وصول کر لیتے تھے مثلاً کوئی ہاکر دو سو اخباروں کا آرڈر دیتا تو اس سے دو سو اخباروں کے پیسے لے کر کاغذ خرید کر پریس میں پہنچا دیتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ پریس میں کاغذ پہنچتا رہتا اور اخبار چھپتا رہتا تھا۔ دہلی سے "انجام" اخبار بھی کراچی آگیا تھا۔ اور یہاں سے نکل رہا تھا۔

"جنگ" اور "انجام" کا سخت مقابلہ تھا۔ شروع میں تو "انجام" ہی کی اشاعت زیادہ رہی۔ لیکن میر صاحب کو اخبار کے لئے کام کرنے والوں کی ایک بہت اچھی ٹیم مل گئی۔ اس ٹیم میں سید محمد تقی، رئیس امروہوی، اور یوسف صدیقی، جیسے منجھے ہوئے صحافی شامل تھے۔ خود میر صاحب کا اپنا حال یہ تھا کہ انہوں نے اپنے اخبار کو کامیاب کرنے کے لئے دن رات ایک کر دیا تھا۔ "انجام" اخبار کے مالک عثمان آزاد اس مقابلے میں زیادہ دور تک نہ دوڑ سکے۔ انہوں نے اخبار پر اتنی محنت اور توجہ نہیں کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۸ء میں "جنگ" اخبار کی لوح پر پہلی بار چھپا: "باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت پاکستان کے ہر روزنامہ سے زیادہ۔"

میر صاحب اس کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھے، وہ اس راز سے بخوبی واقف تھے کہ کسی بھی اخبار کی وقتی کامیابی آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتی۔ کوئی بھی اچھا اخبار اسے شکست دے سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ہر وقت چوکنا رہتے تھے۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ وہ اٹھتے تھے اور ہوا خوری کے بعد دفتر چلے جاتے تھے جہاں رات دو بجے تک کام میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ریڈیو سے تمام بڑے بڑے اسٹیشنوں کی خبریں سنتے، خود نوٹس لیتے، سارے اخبارات پڑھ ڈالتے، ان کی اہم خبروں پر نشان لگا کر شعبہ خبر میں بھجواتے، ان کے اخبار میں کوئی خبر چھپنے سے رہ جاتی تو متعلقہ رپورٹر کو بلا کر سختی سے باز پرس کرتے۔ بعض اوقات وہ اپنے ماتحتوں سے سخت رویہ بھی اختیار کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ کسی قیمت پر اپنے اخبار کا نقصان ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ کم سے کم اخراجات میں ایک اچھا اخبار کیسے نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اخراجات پر کنٹرول کرنے کی بہت زیادہ فکر کرتے تھے۔ دفتر میں ایک سادہ کاغذ بھی انہیں فرش پر پڑا نظر آجاتا تو اسے اٹھا کر رائٹنگ پیڈ میں لگا دیتے اور ایسا کر کے وہ اپنے عملے کو جتلاتے تھے کہ ایک سادہ کاغذ کو بھی فضول اور بیکار مت سمجھو۔

۱۹۶۲ء میں "جنگ" جہازی سائز (موجودہ سائز) میں چھپنے لگا۔ پہلے وہ لیتھو پہ چھپتا تھا پھر آفسٹ پرنٹنگ شروع ہوئی۔ غرضیکہ اخبار ترقی پہ ترقی کرتا چلا گیا۔ اور اب میر صاحب جنگ کے علاوہ مزید اخبارات اور رسائل نکالنے کے منصوبے بنانے لگے۔ انہوں نے بچوں کے لئے ایک رسالہ "بھائی جان" نکالا۔ پھر ایک ہفت روزہ "اخبار جہاں" جاری کیا جو کچھ عرصہ بعد سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ ہو گیا۔ انہوں نے شام کا ایک انگریزی اخبار "ڈیلی نیوز" بھی نکالا۔ "جنگ" کراچی میں خوب مستحکم ہو گیا تو انہوں نے راولپنڈی، کوئٹہ، لندن اور بعد ازاں لاہور سے بھی جنگ کے ایڈیشن جاری کئے۔ اب ان کے دو بیٹے میر جاوید الرحمٰن اور میر شکیل الرحمٰن بھی جوان ہو کر ان کے دست و بازو بن چکے تھے۔ میر شکیل الرحمٰن نے پہلے انگریزی ہفت روزہ "میگ ویکلی" جاری کیا، اس کے بعد "جنگ" لاہور کو کامیاب بنایا اور پھر بیک وقت کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے انگریزی کا روزنامہ "دی نیوز" کا اجرا کیا۔

میر صاحب نے اپنے اخبار کو تکنیکی لحاظ سے ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے لئے پیسہ لگانے سے کبھی نہیں ہچکچائے۔ انہوں نے جہاں ایک شاندار پریس لگایا وہیں جنگ اخبار کو کتابت سے کمپوزنگ پہ بھی منتقل کرنے کی جرات کی۔

ان پے در پے کامیابیوں کی وجہ سے میر صاحب کے بارے میں کہا جانے لگا تھا کہ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگا دیتے ہیں تو وہ سونا ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ روزنامہ "جنگ" کی کامیابی میں اس اخبار کے بے شمار محنتی

کارکنوں کا بھی دخل ہے، مجید لاہوری، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، یوسف صدیقی جیسے بڑے صحافیوں کی تحریری کاوشوں کا بھی ہاتھ ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس اخبار کی کامیابی میں اور اسے ایک عظیم الشان ادارہ بنانے میں میر صاحب ہی کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ انہوں نے اس ادارے کے لئے اپنی پوری زندگی کھپادی۔ اس اخبار نے انہیں کبھی فرصت نہ دی ساری عمر انہوں نے سیر و تفریح کے لئے شاید ہی وقت نکالا ہو اور اس دولت سے لطف اندوز ہوئے ہوں جو انہوں نے خون پسینے سے کمائی تھی اور جمع کی تھی۔ وہ آخر وقت تک اپنے ادارے کے سب سے زیادہ کام کرنے والے کارکن تھے۔ ان کے مزاج میں انکساری تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ کفایت شعار تھے اور اپنے اخبار کو کامیاب کرنے کے لئے انہوں نے بعض اوقات ایسے طریقے بھی آزمائے جو ناپسندیدہ کہے جا سکتے ہیں۔ میر صاحب کہا کرتے تھے کہ ان کے پاس آج جو کچھ ہے وہ صرف پاکستان کی وجہ سے ہے۔ وہ سچ کہتے تھے جس پاکستان نے میر صاحب کو سب کچھ دیا اس پاکستان کو میر صاحب بھی بہت کچھ دے سکتے تھے..... افسوس کہ انہوں نے اس پاکستان کو صرف اردو کا سب سے زیادہ بکنے والا اخبار دیا..... لیکن ان کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس حوالے سے وہ اردو صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے

چیزوں کی کہانی

میز

آصف فرخی

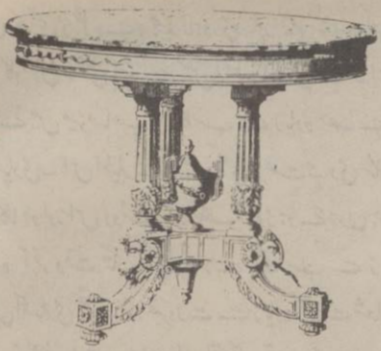

کرسی اور میز دنوں کا نام اکثر ساتھ لیا جاتا ہے۔ حالاں کہ دونوں اپنی جگہ مکمل ہیں، اور ایک پوری چیز ہیں، پھر بھی ایک کا تصور دوسرے سے اس طرح وابستہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لئے کرسی کے بعد میز کی باری آنا ہی تھی۔

جب میزیں عام نہیں ہوئی تھیں تو لوگ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کرسی نے یہ طریقہ بدل دیا۔ کرسیوں کی موجودگی میں، صاحبِ مرتبہ لوگوں کو یہ بات اپنے وقار اور حیثیت کے منافی معلوم ہوئی کہ زمین پر سے جھک جھک کر کھانا اٹھائیں۔ اس لئے کھانے کی چیزوں کو لکڑی کے تختوں پر چن دیا گیا جہاں سے انہیں اٹھانا آسان تھا۔ اب کرسی پر بیٹھ کر کھانا آسان ہوگیا جن تختوں پر کھانا چنا جاتا تھا، وہ بڑھتے بڑھتے کھانے کی میز بن گئے۔

قدیم زمانے میں صرف اُمرا اور رؤسا میزیں استعمال کرتے تھے، مصر اور یونان کے پرانے معاشروں میں یہ دستور تھا کہ بڑی بڑی میزوں کے بجائے، مہمانوں کو چھوٹی چھوٹی، الگ الگ میزوں کے سامنے بٹھایا جاتا۔ اس کے برخلاف روم میں مہمان، آرام دہ تخت پر نیم دراز ہو جاتے اور ان کے سامنے سنگ مرمر کی لمبی چوڑی میزیں بچھی ہوتیں جن پر سے وہ اپنی پسند کی غذائیں اٹھا کر کھاتے۔ کھانا پکانے کے دوران باورچی خانے کی میز استعمال کرنے کا طریقہ بھی اسی دور میں پڑا۔

ہمارے معاشرے میں کھانے کی میز کا رواج زیادہ پرانا نہیں۔ میز کی آمد سے پہلے دسترخوان بچھایا جاتا اور سب لوگ اس کے گرد بیٹھ جاتے۔

کھانے کی میز کے علاوہ لکھنے کی میز بھی عام ہے۔ پرانے زمانے میں لکھنے کی میز نہیں ہوتی تھی۔ مصر، یونان اور روم کے قدیم معاشروں میں، لوگ تختی یا جس چیز پر لکھ رہے ہوتے،

اسے اپنے گھٹنوں پر یا گود میں رکھ کر لکھتے۔ پڑھتے وقت بھی تختی کو اسی طرح جما لیتے۔ اس وقت کتابیں، تختی یا گول گول موڑے ہوئے مسودوں کی شکل میں ہوتی تھیں۔ کتاب کو جس شکل میں ہم جانتے ہیں، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے دور میں قائم ہوئی۔ اس وقت کتابوں کے سرورق، لکڑی یا دھات کے بنے ہوئے ہوتے، اور ایک کتاب کا وزن کئی سیر ہوتا۔ ایسی کتاب کو گود میں رکھ کر پڑھنا ممکن نہیں تھا۔ ایسی کتابوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے لکڑی کے سہارے استعمال کئے جاتے اور ان سہاروں کو میز پر رکھا جاتا۔ ہمارے ہاں ایسی قیمتی یا قابل تعظیم کتابوں کو رکھنے کے لئے رحل استعمال ہوتی آئی ہے۔

کتابوں کو رکھنے والے سہارے کو ذرا سا ترچھا کر کے مناسب لمبائی کا بنا یا گیا تو کتابوں کا اسٹینڈ بن گیا جو پرانے زمانے کے علما کے لئے لکھنے کی میز کا کام بھی دیتا تھا۔ اس پر لکڑی کے ایک اور تختے کا ڈھکنا بھی لگا دیا گیا تو اس کے اندر کاغذ اور قلم رکھنا آسان ہو گیا۔ اس میں پائے اور درازیں بھی لگا دی گئیں تو لکھنے کی میز تیار ہو گئی۔

اٹھارویں صدی میں لکھنے کی میز پر نیم بیضوی ڈھکنے لگانے کا رواج عام ہو گیا، جو تہہ ہو جاتے تھے۔ ایسی میزوں میں اہم کاغذات رکھ کر تالا لگایا جا سکتا تھا۔ لکھنا پڑھنا تہذیب کی اہم ترین نشانی سمجھا جانے لگا، اور اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دینے کے لئے لوگ لکھنے کی میزیں گھروں میں رکھنے لگے۔

اس زمانے میں کئی طرح کی میزیں سامنے آنے لگیں، ورنہ روم کے زوال کے صدیوں بعد بھی میزیں صرف بہت امیر لوگوں کے ہاں استعمال ہوتی تھیں۔ کھانے کی میز لکڑی کے ایک تختے سے زیادہ نہ تھی، جس میں پائے کے بجائے قینچی دار بیٹھک ہوتی۔ کھانا کھانے کے بعد میز کا تختہ الگ ہو جاتا اور بیٹھک کو الگ ایک طرف رکھ دیا جاتا۔ میز کے اوپری تختے میں جگہ بنی ہوتی جس میں کھانا نکالا جا سکتا تھا اور رکابیوں کی ضرورت نہیں رہتی۔

اٹھارویں صدی میں میز کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ امیروں کے گھر میں اعلا درجے کی عمدہ میزیں رکھی جاتیں۔ کھانے کی میزیں بڑی بڑی ہونے لگیں ماہر فن کاری گر میزوں کی آرائش کے لئے طرح طرح کی چیزیں تیار کرتے اور میز کو سجا دیا جاتا۔ اسی زمانے سے فرنیچر کا کاروبار چلا۔

لوگوں کا ذوق اور فیشن بدلنے لگا تو اس کے ساتھ فرنیچر بھی بدلتا گیا۔ میزیں بنانے والے طرح طرح کے نمونے سامنے لے کر آئے۔ بڑی ہو جانے والی میز سامنے آئی۔ جس کے بیچ میں ایک پٹڑا لگ جاتا اور میز پھیل جاتی۔ سلائی کڑھائی کرنے والی

خواتین کے لئے سینے کی میز سامنے آئی۔ جس میں سوئی دھاگوں کے لئے الگ الگ خانے بنے ہوئے تھے۔ آسٹریا کی ملکہ کو اپنے سنگھار کا سامان رکھنے کی ضرورت ہوئی تو دربار کے کاری گروں نے میز پر آئینے لگا کر سنگھار میز بنائی، جو جلد ہی ساری دنیا میں مقبول ہوگئی۔

اب کئی قسم کی میزیں استعمال ہوتی ہیں۔ کھانے کی میز، لکھنے کی میز، سینے کی میز اور سنگھار میز کے علاوہ، اسکول کے بچے جس ڈیسک پر بیٹھتے ہیں، دکانوں کا کاؤنٹر، کمپیوٹر یا ٹی وی، وی سی آر رکھنے کا کنسول اور مصوروں، انجینئروں کا ڈرائنگ بورڈ، یہ سب میز کی مختلف شکلیں ہیں۔

میز بڑی دور سے آئی ہے اور اس نے بہت روپ بدلے ہیں۔

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

SOHRAB KICS LTD

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

Midas

کرشمہ

اظہر نیاز

قسط نمبر ۳

جواد ذیشان کا دوست تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو، آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا ایک بار اس نے اسکول میں اچانک یہ شور مچا کر کہ چھت گرنے والی ہے، پوری کلاس کو کمرے سے باہر نکال دیا اور واقعی تھوڑی دیر بعد چھت گر گئی۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ آج بھی وہ ذیشان سے ملنے آیا تو آغا عمران سے اس کی ملاقات ہوگئی جنہوں نے جواد کو خوش خبری سنائی کہ وہ حسب خواہش ٹی وی کے ڈراموں میں کام کر سکتا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ایک دوست ٹی وی پروڈیوسر کے نام تعارفی خط بھی دیا۔ مگر جواد نے انہیں جو بات بتائی اسے سن کر وہ ڈر سے گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔

آغا عمران دفتر پہنچے تو پہلا ٹیلی فون آئی جی صاحب کا تھا۔ انہوں نے ایک بہت اہم کیس ان کے حوالے کیا تھا اور اس کے بارے میں ضروری ہدایات اور ممکن قانونی اختیارات بھی دیئے تھے۔ انسپکٹر شعیب کو ان کا مددگار بنایا گیا تھا جو ایک طرح سے آغا صاحب کے دست راست تھے۔ جواد، آغا عمران کا خط لے کر اپنی امی کے ساتھ ٹیلی ویژن اسٹیشن پہنچا تو اس کی ملاقات پروڈیوسر انصاری صاحب سے ہوئی۔ آڈیشن میں جواد کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور انصاری صاحب نے اسے پیدائشی اداکار قرار دیتے ہوئے ڈرامے کے لئے منتخب کر لیا جس میں اسے ایک چلڈرن کلب کے چیئرمین کا کردار کرنا تھا۔ انصاری صاحب سے رخصت ہونے سے قبل جواد نے ٹی وی اسٹیشن کو بجلی کی فراہمی کے ذرائع کے

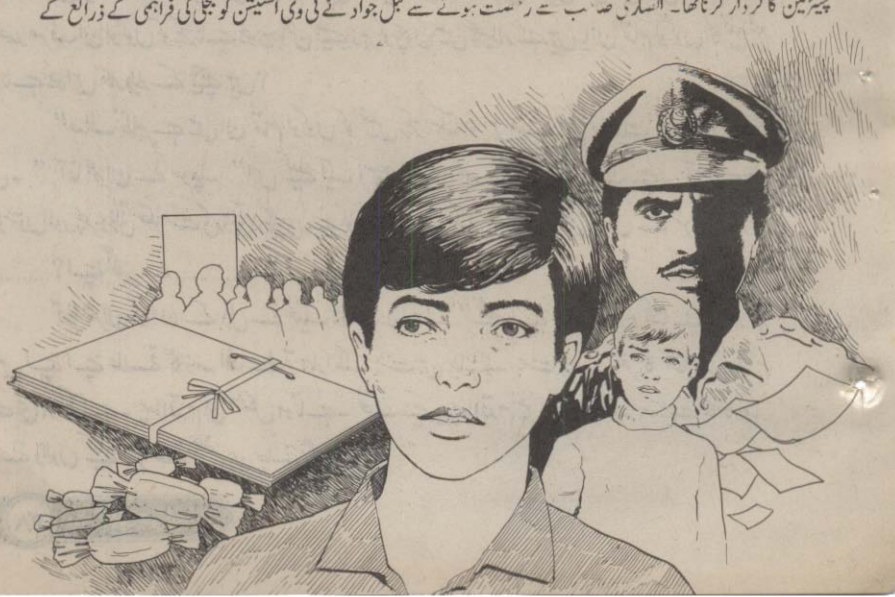

بارے میں ایک غیر متوقع سوال کیا تو انصاری صاحب نے اسے بتایا کہ بجلی چلی جانے کی صورت میں جنریٹر استعمال ہوتا ہے۔ اور اگر وہ بھی خراب ہو تو ظاہر ہے اسٹیشن کا سارا کام رک جائے گا۔ جب جواد ان کے کمرے سے نکلا تو اچانک لائٹ آف ہوگئی۔ جنریٹر کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھی خراب ہے۔ انصاری صاحب نے سوچا، کیا یہ محض اتفاق ہے۔

اب آپ آگے پڑھیئے

آغا عمران فائل کا مطالعہ کر چکے تھے۔ یہ فائل منشیات کی فروخت کے بارے میں تھی لیکن پوری فائل میں نہ تو مجرموں کے بارے میں کوئی معلومات تھیں اور نہ ہی کسی پر شبہ ظاہر کیا گیا تھا..... فائل میں موجود ایک اخباری تراشے نے ان کو سخت پریشان کر دیا تھا۔ یہ تراشہ ایک روزنامہ کا اداریہ تھا۔ جس میں یہ دل ہلا دینے والا انکشاف کیا گیا تھا کہ "کراچی میں اب ہیروئن کھلم کھلا اسکولوں کے بچوں تک پہنچائی جانے لگی ہے۔" اس اداریئے میں معروف سماجی شخصیت کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ انہوں نے خود تحقیق کے طور پر اسکولوں کے سامنے سے ہیروئن خریدی ہے۔ یہ ہیروئن ٹافیوں میں ملی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بہت سے اسکولوں کے بچے ہیروئن کے عادی ہو چکے ہیں۔ اداریئے میں مزید تفصیلات کے بعد حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس سنگین صورتحال کا جائزہ لے تاکہ کم از کم قوم کے معصوم بچے اس لعنت سے محفوظ رہیں۔

آغا عمران سمجھ گئے کہ غالباً اس اداریئے کی وجہ سے ہی حکومت اس کیس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ آغا عمران کاغذ قلم لے کر بیٹھے ہوئے تھے اور اس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہے تھے۔ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، اپنی تفتیش کہاں سے شروع کریں؟ کیا اس فائل کو کھولنے کا مقصد صرف ان لوگوں کو پکڑنا ہے جو ہیروئن جیسے زہر کو بچوں میں پھیلا رہے ہیں یا ان تمام لوگوں کا قلع قمع کرنا ہے جو اس کاروبار کے پیچھے ہیں؟

"صاف ظاہر ہے میں ان تمام لوگوں کو نہیں پکڑ سکتا جو اس ملک میں منشیات کا دھندا کرتے ہیں۔" آغا عمران نے سوچا۔ "اس کیلئے ایک وسیع تر پلان اور پالیسی کی ضرورت ہے۔ تمام صوبائی حکومتوں اور پھر وفاقی حکومت کی ذاتی دلچسپی سے کوئی پلان بن سکتا..... تو میں کہاں سے شروع کروں .....؟ اپنے گھر سے .....۔"

آغا عمران کو ان کے دل نے ٹھیک جواب دیا تھا۔ "مجھے اپنے علاقے کو دیکھنا ہے۔ اگر ہر شخص اپنے اپنے علاقے کا ذمہ اٹھالے تو ہمارا ملک جنت بن جائے۔ بہت بڑے سفر کا آغاز ایک قدم سے ہی ہو سکتا ہے۔ پہلا قدم ہی مشکل ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے یہ پہلا قدم میں اٹھاؤں گا۔ منشیات کا کاروبار کرنے والوں کیلئے میرا علاقہ جہنم بن جائے گا۔"

آغا عمران کئی دنوں سے سوچ رہے تھے کہ مری چلے جائیں تاکہ ایک ہفتہ وہاں بیٹھ کر کوئی پلان تیار کر سکیں۔ انہیں پہلا قدم اٹھانا مشکل لگ رہا تھا۔ آخر انہوں نے سوچا اس مرتبہ ذرا مختلف انداز میں ..... آر ..... یا، پار .....

"ہیلو انسپکٹر شعیب .....!"

انہوں نے انٹر کام پر انسپکٹر شعیب کو اپنے کمرے میں بلایا اور اپنے پہلے قدم کی تفصیلات سے آگاہ کیا ..... "علاقے کے تمام اسکولوں کی نگرانی سخت کر دی جائے ..... اسکولوں کے باہر سامان بیچنے والوں پر نظر رکھی جائے ..... ان تمام لوگوں کے بارے میں رپورٹ تیار کی جائے ..... میں ذیشان کو سمجھا دوں گا۔ مختلف اسکولوں کے سامنے سے ذیشان کے ذریعے ٹافیاں، آئس کریم اور دوسری کھانے پینے کی اشیاء جس میں ہیروئن کا خدشہ ہو سکتا ہے خریدی جائیں گی۔ ذیشان چیزیں خرید کر آپ کو لا دیا کرے گا۔ آپ کی ٹیم ہر شے کا الگ الگ پیکٹ بنائے گی۔ کیا چیز کہاں سے خریدی گئی؟ اور فوراً لیبارٹری روانہ کر دی جائے گی تاکہ تجزیہ کیا جا سکے" ..... تھوڑے توقف کے بعد انہوں نے کہا،

"مجھے ایک ہفتے کے اندر رپورٹ چاہئے۔ علاقہ کے تمام مشکوک اڈے جہاں منشیات کے فروخت ہونے کے چانس ہو سکتے ہیں ..... ہاں! ایس ایس پی راؤ اقبال صاحب سے بات کرو ..... امید ہے ان کے پاس پہلے سے ہمارے کام کی کافی تفصیل موجود ہوں گی" ..... وہ پھر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوئے۔

"وہ تمام سرکاری و غیر سرکاری اسپتال جہاں نشے کے عادی لوگوں کا علاج ہوتا ہے۔ ان کی رپورٹ ..... وہاں موجود مریضوں کے بارے میں تفصیلات ..... پرائیویٹ ادارے جو ترکِ منشیات کے نام پر منشیات فروخت کرنے کا دھندا کرتے ہیں۔"

"کیا آپ کا بھی خیال ہے کہ ایسا ہوتا .....؟" انسپکٹر شعیب نے آغا عمران سے پوچھا۔

"ممکن ہے یہ افواہ ہو ..... بہرحال مجھے رپورٹ درکار ہے۔ ایک فہرست مجھے ایسے لوگوں کی چاہئے جو پچھلے دس برسوں میں کروڑ پتی ہوئے ہیں ..... اور دس برس پہلے یہ لوگ مڈل کلاس سے تعلق رکھتے تھے یا مڈل کلاس سے بھی کم ..... جنہیں آپ غریب بھی کہہ سکتے ہیں ..... ایک فہرست مجھے ایسے لوگوں کی درکار ہے جو کچھ نہیں کرتے ..... میرا خیال ہے کہ ہر وہ شخص جو ملازمت کرتا ہے، کسی بھی جگہ نوکری کرتا ہے، اس کے غلط کام میں ملوث ہونے کے چانس نہایت کم ہیں

ایسے لوگ جو کچھ نہیں کرتے، نہ سرکاری ملازمت، نہ کسی پرائیویٹ ادارے کی ملازمت، نہ بزنس ..... ایسے لوگ کیا کرتے ہیں ..... ؟ ان کا ذریعہ آمدنی کیا ہے ..... ؟ میرے علاقے میں کتنے لوگ ہیں جو کچھ نہیں کرتے ..... ؟ مزید یہ کہ تمام تھانوں سے مشکوک لوگوں کی فہرست۔ "

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف سے ایس ایس پی اقبال صاحب تھے۔ "بھئی آئی جی صاحب کے حکم کے مطابق ایک فائل آپ کو پہنچانی ہے۔ اس فائل میں ان تمام لوگوں کا ریکارڈ ہے جو میری نظر میں مشکوک ہیں، منشیات کا کاروبار کرتے ہیں، اسلحہ کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں یا اغوا برائے تاوان جیسے جرائم میں شریک ہیں ..... رائٹ ..... ! "

"رائٹ سر ..... " آغا عمران نے کہا، "میں ابھی انسپکٹر شعیب سے بات کر رہا تھا اور مجھے اسی فائل کی ضرورت ہے۔ میں ابھی انسپکٹر شعیب سے کہتا ہوں، وہ آپ سے فائل لے لے گا۔ بہت بہت شکریہ اقبال صاحب ..... تھینک یو۔ "

"آل رائٹ ..... آل رائٹ۔ " ایس ایس پی صاحب نے کہا۔

اور آغا عمران نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

"لڑکے ..... ! " آغا عمران نے اپنے خاص انداز میں انسپکٹر شعیب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ..... "فوراً اقبال صاحب کے پاس چلے جاؤ ..... وہ ایک فائل دیں گے، بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک اہم فائل ہے۔ تمہارے علاوہ وہ فائل کسی کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئے۔ یہ میرا کارڈ لے جاؤ، اقبال صاحب اس کارڈ کے بغیر وہ فائل تمہیں نہیں دیں گے۔ "

انسپکٹر شعیب نے مسکراتے ہوئے کارڈ پکڑ لیا اور سلیوٹ مار کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

انسپکٹر شعیب کو گئے ابھی پانچ منٹ گزرے تھے کہ آغا عمران کو وائرلیس سے انسپکٹر شعیب کا پیغام موصول ہوا ..... "سر ..... ! میں اس وقت مال روڈ سے گزر رہا ہوں ..... مجھے شک ہے کہ میرا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ایک سرخ رنگ کی کار میرے پیچھے ہے۔ اب میرے لئے کیا حکم ہے ..... ؟ میں اقبال صاحب کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں ..... اوور ..... " "تم اقبال صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے فائل لے کر آؤ میں چیک کرتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں ..... اوور ..... "

"ہیلو ..... اقبال صاحب ..... " آغا عمران نے فوراً اقبال صاحب کا فون نمبر گھمایا .....

"انسپکٹر شعیب آپ کے پاس آ رہا ہے ..... میرا کارڈ اس کے پاس ہے .....

آپ اسے اصلی والی فائل نہ دیجئے گا بلکہ کسی فائل کور میں چند ردی کاغذ رکھ کر دیجئے گا....."

"میرے سامنے کچھ کاغذ پڑے ہیں" ..... ایس ایس پی اقبال نے کہا ..... "جن پر میرے بیٹے نے کارٹون بنائے ہیں..... میرے خیال میں یہ مناسب رہیں گے....."

○○○○ .....

جواد اور چلڈرن کلب کے دوسرے کردار انصاری صاحب کے کمرے میں موجود تھے۔ ہر بچے کے ہاتھ میں اس کا اسکرپٹ تھا اور وہ اسکرپٹ کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے جملے بول رہے تھے۔ انصاری صاحب بچوں کو بتا رہے تھے کہ کہاں آواز کو اونچا کرنا ہے؟ کہاں آہستہ بولنا ہے؟ کہاں ٹھہرنا ہے؟ کہاں وقفہ زیادہ دینا ہے؟ اور کون سے لفظ کو زور دے کر بولنا ہے؟ اور ساتھ ہی ساتھ چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کیا کام لینا ہے.....؟

اتنے میں ایک خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ انصاری صاحب نے تمام بچوں سے ان کا تعارف کرایا.....

"یہ ہیں مس نائلہ ..... آپ کے کلب کے بچوں کو اداکاری سکھائیں گی....."

"کیا انہیں خود اداکاری آتی ہے.....؟" ایک بچے نے سوال کیا۔

"جی..... آتی ہے....." انصاری صاحب نے جواب دیا۔

"سر.....!" ایک بچے نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"ہاں، کیا بات ہے.....؟"

"وہ لوگ جنہیں اداکاری آتی ہے، وہ ٹیلیویژن پر نہیں آتے.....؟"

"میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" انصاری صاحب نے کہا۔

"آپ نے مس نائلہ کو کبھی کسی ڈرامے میں نہیں دیکھا ..... یہی بات ہے نا.....؟"

"جی....." بچے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹے بات یہ ہے کہ مس نائلہ بھی آپ کی طرح نئی ایکٹریس ہیں اور یہ اداکاری سکھانے کی ایکٹنگ کریں گی..... یہ جو کچھ بولیں گی، جو کچھ کریں گی، وہ سب کچھ لکھا ہوگا..... جس طرح آپ لوگوں کا اسکرپٹ لکھا ہوا ہے۔"

"تو مس نائلہ اپنا اسکرپٹ نکالیں اور شروع ہو جائیں....." انصاری صاحب نے خود منظر نامہ پڑھنا شروع کیا۔

بیس پچیس بچے بیٹھے شرارتیں کر رہے تھے۔ نائلہ داخل ہوتی ہے..... سارے بچے کھڑے ہوجاتے ہیں..... نائلہ تمام بچوں کو لائنیں بنانے کا اشارہ کرتی ہیں..... بچے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں..... نائلہ سامنے کھڑی ہیں..... پی ٹی کے انداز میں بازو کھولتی ہیں..... سارے بچے بازو کھولتے ہیں..... سر سے اوپر لے جاتے ہیں..... سامنے کرتے ہیں..... اور پھر نیچے کر لیتے ہیں..... ایک بچہ دوسرے بچے کے کان میں کچھ کہتا ہے..... نائلہ دیکھ لیتی ہیں.....

"نائلہ..... نائلہ کیا سوچ رہی ہیں..... اپنا جملہ بولیں۔"

انصاری صاحب نے نائلہ کو متوجہ کیا..... نائلہ نے سوری کہا اور اپنا جملہ بولا.....

نائلہ..... "اے مسٹر..... کیا نام ہے تمہارا.....؟"

بچہ..... "نعمان۔"

بیٹے..... انصاری صاحب نے کہا..... "آپ وہ نام بتائیں گے جو ڈرامے میں آپ کا نام ہے..... ٹھیک....."

نائلہ..... "اے مسٹر..... کیا نام ہے تمہارا.....؟"

بچہ..... "جی ببلو....."

نائلہ..... "ببلو صاحب کیا بات ہے.....؟"

ببلو..... "جی وہ پوچھ رہا تھا کہ آپ پی ٹی ماسٹر ہیں.....؟"

سارے بچے ہنس پڑتے ہیں.....

نائلہ..... "ابھی آپ پی ٹی نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ ہاتھ اور پاؤں کی مختلف حرکتیں تھیں جو اداکاری کے لئے بہت ضروری ہیں....."

ایک لڑکا ہاتھ کھڑا کرتا ہے۔

نائلہ..... "کیا بات ہے.....؟"

لڑکا..... "میڈم، ماسٹر صاحب تو منع کرتے ہیں، کہتے ہیں حرکتیں مت کرو....."

سب ہنس پڑتے ہیں۔

نائلہ..... "تمہاری ان حرکتوں کے پیچھے دراصل تمہارا شیطانی دماغ بھی ہوتا ہے....."

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی..... بہت سے بچوں کو اداکاری کا بچپن سے شوق ہوگا..... آپ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، اس کی نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے ہیں

..... کوئی ہے جو نقل اتار کر دکھائے ..... ؟"

ایک بچہ ہاتھ کھڑا کرتا ہے۔

بچہ ..... "نہیں میڈم ..... ماسٹر صاحب ماریں گے ..... نقل کرنا بہت بُری بات ہے۔"

نائلہ ..... "جی ہاں! امتحان میں نقل کرنا بہت بُری بات ہے لیکن اداکاری میں ہم نقل ہی کر رہے ہوتے ہیں اور اس میں عقل کی ضرورت ہوتی ہے ....."

ایک اور بچہ اٹھ کر سامنے آجاتا ہے اور فقیر کی نقل اتارتا ہے۔ اس طرح دو چار بچے آتے ہیں جو مختلف کرداروں کی نقلیں اتارتے ہیں۔ اتنے میں ایک بچہ سب سے چھوٹی انگلی کھڑی کرتا ہے۔

نائلہ ..... "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ..... انگلی نیچے کرلو ..... میں سب کو چھٹی دینے والی ہوں ..... میری آج کی آخری بات سن لیں۔ اداکاری کیلئے اچھی صحت بہت ضروری ہے اور اچھی صحت کیلئے اچھے دانت ضروری ہیں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے اٹھا کریں ..... نماز پڑھا کریں، پھر صبح کی سیر کو جایا کریں، اور باہر کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں ہلایا کریں ..... اور خوش رہا کریں ....."

سارے بچے مل کر ہنستے ہیں اور بکھر جاتے ہیں۔

"ٹھیک ہے ....." انصاری صاحب نے کہا۔

"ریہرسل ختم کل گھر پر ریہرسل کریں ..... پرسوں ریکارڈنگ کریں گے۔ باہر وین موجود ہے وہ سب بچوں کو ان کے گھر اتار دے گی ....." تمام بچے اپنے اپنے اسکرپٹ تھامے کھڑے ہوگئے۔

ایک بچے نے اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور کھانے کیلئے ایک ٹافی نکالی ..... اس کا کاغذ اتارا اور اس سے پہلے کہ وہ منہ میں ڈالتا ..... جواد نے جھپٹ کر اس سے ٹافی چھین لی ..... اور پھر دونوں بچوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے ..... ؟" انصاری صاحب نے پوچھا۔

"یہ چیئرمین کے بچے نے میری ٹافی چھین لی ہے ....."

"جواد ..... ! یہ کیا حرکت ہے ..... ؟" انصاری صاحب نے غصہ سے کہا۔

"سر ..... یہ ٹافی اس کو نہیں کھانی چاہئے۔"

"اور تمہیں کھانی چاہئے ..... ؟" انصاری صاحب نے کہا۔

تمام بچے ہنسنے لگے۔

"چلو ٹافی واپس کرو۔"

جواد نے ٹافی واپس کر دی ..... اور اس بچے نے ٹافی منہ میں ڈال لی ابھی بچے انصاری صاحب کے کمرے میں تھے۔ اسسٹنٹ پروڈیوسر ڈرائیور کو تلاش کرنے گیا ہوا تھا۔

اچانک ٹافی کھانے والا بچہ چکرا کر گر پڑا۔ اس کا سر ایک کرسی کے کونے سے ٹکرایا اور وہاں سے خون نکلنے لگا .....

یکدم سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ مس نائلہ نے بچے کو گود میں اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگی۔ انصاری صاحب اور بچے ساتھ تھے۔ معاون پروڈیوسر ڈرائیور کو تلاش کر چکا تھا۔ بچے کو فوراً وین میں ڈالا اور اسپتال کی طرف دوڑے۔

اسپتال میں پہنچتے ہی جواد نے ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر سے اجازت لے کر ذیشان کو فون کیا۔

"ہیلو ذیشان ..... کیا انکل گھر پر ہیں .....؟"

"نہیں تو ....."

"آنٹی سے پوچھو ..... ممکن ہے انہیں پتا ہو ..... وہ جہاں بھی ہوں انہیں جنرل اسپتال کی ایمرجنسی میں بھیج دو ..... ایک بچہ ٹافی کھا کر بیہوش ہو گیا ہے ..... میرا خیال ہے کہ ٹافی میں کوئی نشہ آور شے ملی ہوئی تھی ....."

(جاری ہے)

نانی اماں

شازیہ فرحین

مجھے نانی اماں بہت اچھی لگتی تھیں مگر اس وقت جب میں چھوٹی تھی، اتنی چھوٹی کہ رنگ برنگی تتلیوں کے پیچھے بھاگا کرتی اور رات ہوتے ہی ان کی گود میں سر رکھ کر پریوں اور شہزادوں کی ڈھیروں کہانیاں سنا کرتی مگر وقت کو ہم اپنے قابو میں نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو بڑے ہونے سے روک بھی نہیں سکتے۔

یہی وجہ ہوئی کہ میں جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، مجھے نانی اماں سے سخت الجھن محسوس ہونے لگی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں ان سے اکتا گئی تھی بلکہ بات یہ تھی کہ انہیں اب میرے ہر کام میں مین میخ نکالنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ میری ان سے بیزاری کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں اور میرے ساتھ کہیں آجا بھی نہیں سکتی تھیں اور نہ میرے بہت سے کام نمٹا سکتی تھیں اب تو ان کا بس ایک ہی کام تھا میرے ہر کام میں سو عیب نکالنا اور میری غلطیوں کو انگلیوں پر گنوانا۔ در گزر کرنا تو انہیں آتا ہی نہ تھا۔

کل ہی کی بات ہے چچا جان کافی دنوں بعد گھر آئے تھے اور مجھے قریب بٹھا کر نہ جانے کس کس

جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ چچا جان کی پُر لطف باتیں ہمیشہ مجھے بہت مزہ دیتی تھیں اور آج بھی میں ان سے باتیں کر کے بہت خوش ہو رہی تھی۔

"گڑیا! باتیں ہی کرو گی یا چچا جان کو چائے بھی پلواؤ گی، جاؤ جلدی سے چائے بناؤ!" نانی اماں نے لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا تو میری پیشانی پر تیوریاں پڑ گئیں۔ چچا جان انگلینڈ کے اتنے مزیدار قصے سنا رہے تھے مگر نانی اماں کو یہ کب پسند تھا۔ میں بڑبڑاتی ہوئی کچن میں گئی اور منٹوں میں چائے بنا کر لاؤنج میں آ گئی۔ جہاں نانی اماں اور امی، چچا جان سے باتیں کر رہے تھے۔ پیالیوں میں چائے انڈیل کر میں نے سب کو ایک ایک پیالی پکڑائی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ چائے میں پتی اتنی زیادہ کیوں ڈال دی، ہر کام ذرا سلیقے سے کیا کرو۔" نانی اماں نے حسب عادت سرزنش کی تو میں اپنی جگہ شرم سے کٹ کر رہ گئی۔ انہوں نے تو چچا جان کے سامنے بھی نہ بخشا حالانکہ آنکھوں ہی آنکھوں میں، میں نے انہیں اشارہ بھی کیا کہ خدارا چپ ہو جائیں مگر اب تو وہ اتنی بوڑھی ہو چکی تھیں کہ اشارے بھی نہیں سمجھتی تھیں۔

ان دنوں گرمیوں کی تعطیلات کے باعث میں نے اپنے لئے کئی مصروفیات تلاش کر رکھی تھیں۔ جن میں کاغذ، اور کپڑے سے پھول بنانا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ میں گھنٹوں بیٹھی، نت نئے طریقوں سے پھول بنایا کرتی اور امی کی تعریفیں میرا حوصلہ بڑھا دیتیں۔

"اے لڑکی کیا دن بھر یہی ہو گا یا کچھ پڑھائی بھی؟" نانی اماں نے تنقیدی نظروں سے مجھے گھورا تو میں خاموش رہی اور اپنے کام میں مصروف رہ کر لاپرواہی سے ان پھولوں کو دیکھنے لگی جو واقعی میرے ہاتھوں کا شاہکار تھے۔

"نانی اماں آپ کو میرے بنائے ہوئے پھول اچھے نہیں لگتے!" میں نے توصیفی نظروں سے پھولوں کو دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا تو وہ بغور پھولوں کو دیکھنے لگیں اور جب اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تو تنقید کا پہلو بھی ان کے ہاتھ آ ہی آ گیا۔

"یہ ٹہنیوں کو آپس میں کیسا جوڑ رکھا ہے اسے تو پیچھے کی طرف خم دے کر لگاؤ۔" انہوں نے پھولوں کو ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا تو میں جی جان سے جل کر رہ گئی۔ وہ پہلے تو ایسی نہ تھیں مجھے یاد ہے جب میں دوسری کلاس میں تھی اور میں نے اپنی گڑیا کے کپڑے خاصے بے ڈھنگے انداز میں سی سی کر انہیں دکھائے تھے تو پیار سے بے اختیار انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں پھولے نہیں سما رہی تھی مگر اب اور جب میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ میری پیاری نانی اماں تھیں اور اب وہ نہ جانے کیسی ہو گئی تھیں۔

چھٹیاں ختم ہوتی جارہی تھیں اور میرا اسکول کا کام اب تک ختم نہ ہو پایا تھا اس لئے میرے شب و روز ہوم ورک میں صرف ہو رہے تھے اور نانی اماں کو یقیناً میرا یہ طرزِ عمل سخت ناپسند تھا۔

"اپنی امی کو دیکھو، اکیلے کچن میں رہتی ہیں اور تم اتنی لاپروا ہو کہ امی کا ہاتھ بھی نہیں بٹا سکتیں۔ اگر وقت پر اسکول کا کام کرلیا ہوتا تو یہ نوبت نہ آتی ....." نانی اماں نے خفگی سے مجھے ڈانٹا تو بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے تو اب حد کر دی تھی۔ دن میں سو دفعہ مجھے ڈانٹنا، ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ شاید مجھے ڈانٹے بغیر ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا"، میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں آکر خوب جی بھر کر رونے لگی۔ میرے دل میں اندر ہی اندر نانی اماں کے لئے بیزاری اور جھنجلاہٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ پہلے ان کا وجود میرے لئے روشنی کا باعث تھا اب مجھے وہ بالکل اندھیری رات کی مانند لگتی تھیں۔ ان کے ساتھ قدم ملا کر چلنا میرے لئے انتہائی مشکل تھا۔ آج کے واقعے نے میرے دل میں غصے کی آگ سی بھر دی تھی اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ آئندہ نانی اماں کی شکل بھی نہ دیکھوں، کیونکہ اب وہ پہلے والی نانی اماں تو نہ تھیں، پیار کرنے والی، محبت کے بول بولنے والی اور اپنی گود میں بٹھا کر میٹھی لوریاں سنانے والی۔ پہلے ان کے پہلو میں لیٹ کر مجھے محبت و شفقت کی خوشبو ہی خوشبو محسوس ہوتی تھی مگر اب سب کچھ بدل گیا تھا۔

"نانی اماں آپ کو کیا ہوگیا ہے آپ ایسی تو نہ تھیں۔" میں اندر ہی اندر اپنے آنسوؤں کو پیتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ کافی دیر تک سوچوں کے حصار نے مجھے مقید رکھا اور ان تمام سوچوں کا حاصل یہ نکلا کہ نانی اماں سے کبھی بھی بات نہ کی جائے جب وہ مجھے ہمیشہ ڈانٹتی رہتی ہیں تو میں کیوں بھلا ان کے آگے پیچھے ہوتی رہوں۔ اپنی اس سوچ پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کا عزم کر کے میں نے اپنا ہوم ورک دوبارہ کرنا شروع کر دیا۔

پرسوں میری عزیز ترین سہیلی سیما کی سالگرہ تھی اور میری شرکت لازمی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں اسے کوئی بہت خوبصورت سا تحفہ دوں ایسا تحفہ جو ہماری دوستی کو بہت ہی مضبوط ڈور میں باندھ دے کیونکہ تحفے تو خلوص کو بڑھاتے ہیں اور دوستی کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیتے ہیں۔ اسی لئے میں نے امی سے کچھ پیسے مانگے۔

بڑی مشکلوں سے امی دو سو روپے دینے پر راضی ہوئیں۔ پیسے لے کر میں کاشف بھیا کے ساتھ بازار روانہ ہوگئی۔ ڈھیروں چیزوں میں سے مجھے ایک بہت خوبصورت سا جیولری بکس پسند آیا۔ ڈھائی سو روپے کا تھا۔ بالآخر کاشف بھیا نے بحث اور کچھ خوشامد کر کے دکاندار کو دو سو روپے تک پر آمادہ کرلیا لیکن جب میں نے پیسے نکالنے کے لئے پرس میں ہاتھ ڈالا تو ہلکی سی چیخ میرے منہ سے نکل گئی کیونکہ

پرس کے نیچے ایک بڑا سا سوراخ تھا۔ اور پرس خالی تھا۔
میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ واپس جاتے ہوئے میں نے کاشف بھیا سے کہا۔

"کاشف بھیا پلیز، امی یا نانی اماں کو مت بتانا!"

"لیکن تمہاری یہ حرکت بہت بُری تھی اتنی لاپرواہی تو اچھی نہیں ہوتی۔" کاشف بھیا نے تنبیہ کی۔ گھر پہنچ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ کسی کی گود میں سر رکھ کر خوب روؤں۔ مگر.....!

رات کی سیاہی چاروں سمت پھیل گئی تھی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی اس جیولری بکس کو یاد کر رہی تھی جسے میں نے اپنی ہی لاپرواہی سے گنوا دیا تھا اور سچ تو یہ کہ دوبارہ امی سے پیسے مانگنے کی مجھ میں ہمت بھی نہ تھی۔ اس لئے میں دل ہی دل میں بہت پریشان تھی کیونکہ سیما کی سالگرہ میں جانا تو تھا ہی اور بغیر تحفے کے جانا! اس تصور ہی سے میں شرمندگی کے دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ ان سوچوں میں رات کا ایک بج گیا مگر نیند کی پریاں نہ جانے کہاں جا چھپی تھیں اور میری آنکھیں چپ چاپ برس رہی تھیں کہ اچانک ایک کمزور سا ہیولہ مجھے اپنے کمرے میں آتا دکھائی دیا اور اس ہیولے نے اپنا مہربان ہاتھ میری پیشانی پر رکھ دیا۔ ٹھنڈا نرم گداز ہاتھ۔ میں نے غور سے دیکھا اور پھر شناسا نظریں میری نظروں سے جا ٹکرائیں۔ وہ نانی اماں تھیں جن سے میں سخت ناراض تھی اور جن سے میں نے بات نہ کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

"گڑیا پریشان ہو؟" انہوں نے ہولے سے پوچھا تو میں خاموش رہی۔

"مجھے سب خبر ہو گئی ہے اچھا اب رونے کی ضرورت نہیں ہے یہ لو دو سو کے بجائے ڈھائی سو کا کوئی تحفہ اپنی سہیلی کے لئے خرید لینا۔ اور ہاں میں نے تمہاری امی کو پیسوں کے گم ہونے کا نہیں بتایا ہے۔" نانی اماں نے رازدارانہ انداز میں کہتے ہوئے میرے ہاتھوں پر وہ پیسے رکھے اور واپس جانے کے لئے مڑ گئیں۔ میرے لئے یہ لمحہ سخت حیرت کا باعث تھا۔

"تو نانی اماں میری ہر بات جان لیتی ہیں۔ شاید وہ اب بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں اور مجھے پریشان نہیں دیکھنا چاہتیں۔" میں نے ندامت کے احساس سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

"نانی اماں ادھر آیئے۔" میں نے انہیں جاتا دیکھ کر پکارا تو انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا "نانی اماں! آپ کتنی اچھی ہیں!!!" میں نے جذبات سے لبریز آواز میں کہا۔ نانی اماں کچھ کہے بغیر مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ اب بھی وہی نانی اماں تھیں۔ میرے بچپن والی۔

انعامی لطیفہ

صاحب کسی کے گھر مہمانوں کو آنا ہوتا ہے۔ ماں باپ بچوں کو باتمیز بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو لیجئے مہمان آگئے۔ وہ بچوں سے کہتے ہیں "بیٹا ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔" بچے بڑے ادب سے جواب دیتے ہیں۔

"انکل ہم کھانا کھا چکے ہیں۔" پھر وہ بچوں سے کہتے ہیں۔ "بیٹا یہ پیسے رکھ لیں ہم آپ کے لئے کوئی تحفہ لانا بھول گئے۔" بچے کہتے ہیں "پیسے تو ہمارے پاس ہیں اور کل امی ابو نے ہمیں بہت سی چیزیں بازار سے لاکر دیں ہیں۔" مہمان معاملہ سمجھ جاتا ہے اور کہتا ہے "اچھا بیٹا یہ بتائیں۔ آپ کو بھوک کب لگتی ہے؟" بچے بڑی معصومیت سے کہتے ہیں۔

ماما اور پاپا یہ بتانا بھول گئے ہیں۔ ویسے بھوک تو ہمیں اب بھی لگی ہوئی ہے۔"

عمارہ بشیر احمد ۔ گوجرانوالہ

"ہیلو ہیلو! کیا آپ دفتر انسداد بے رحمی حیوانات سے بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں، فرمائیے؟"

"دیکھئے، یہاں میرے گھر کے سامنے ہمارے علاقے کا ڈاکیا ایک درخت سے لٹک کر میرے کتے کو پریشان کر رہا ہے۔"

معظم اختر..... لاہور

.....○○.....○○.....

ایک دولت مند آدمی جو ہوٹل میں کھانا کھاتا اور بیرے کو بہت بڑی ٹپ دیا کرتا تھا، ایک شام ہوٹل میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اسے ایک دوسرا بیرا اٹینڈ کر رہا ہے۔ دولت مند گاہک نے پوچھا کہ اس کا منظور نظر بیرا کہاں ہے۔

"اب میں ہی آپ کی خدمت کیا کروں گا صاحب۔" بیرے نے جواب دیا۔ "میں نے رات جوئے میں آپ کو اس سے جیت لیا ہے۔"

میاں عبدالستار خان ..... بورے والا

.....○○.....○○.....

استاد (شاگرد سے) راستے کے معنی بتاؤ؟

شاگرد..... جس پر لوگ چلتے ہیں۔

استاد (دوسرے شاگرد سے) اور تم راستی کے معنی بتاؤ؟

شاگرد..... جناب جس پر عورتیں چلتی ہیں۔

مجیداللہ ساجد، اظہر محمود اظہر..... کوٹ قاضی

.....○○.....○○.....

استاد..... کسی زبان کو مادری زبان کیوں کہتے ہیں؟

شاگرد..... کیونکہ امی اتا بولتی ہیں کہ ابو کو بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

مقصود جان بروہی۔(؟)

.....○○.....○○.....

ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بعض اوقات کمینٹیٹر سے بڑی دلچسپ غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔

ایک مرتبہ بی بی سی سے ٹیسٹ میچ اسپیشل پروگرام میں کمینٹری کرتے ہوئے ریڈیو کمنٹیٹر، ڈان موسے نے بڑی روانی سے کہا۔

"ڈیوڈ گاور نے اپنا سوواں ٹیسٹ مکمل کیا اور یہ کارنامہ انہوں نے دوسرے تمام کھلاڑیوں نے مقابلے میں کم میچ کھیل کر انجام دیا۔"

فہمینہ برڑو..... ٹھٹھہ

.....○○.....○○.....

جج (ملزم سے) جب میں وکیل تھا تو تم نے مرغی چرائی تھی، جب میں سرکاری وکیل بنا تو تم نے بکری چوری کی، آج میں جج ہوں تو تم نے بھینس چرائی، آخر کیا وجہ ہے؟

ملزم! جناب میں نے آپ کے ساتھ ساتھ ترقی کی ہے!

یاسمین ناز..... کراچی

.....○○.....○○.....

ایک کاروباری ادارے نے اپنے ملازمین کی تنخواہ کے رجسٹر پر یہ عبارت لکھی۔

"تنخواہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے کسی سے اس کا ذکر مت کیجئے۔" ایک نئے ملازم نے جب پہلی بار تنخواہ کے رجسٹر پر دستخط کئے تو تحریر پڑھ کر اس کے

نیچے لکھ دیا۔

"میں اپنی تنخواہ کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔ اپنی موجودہ تنخواہ بتاتے ہوئے مجھے اتنی ہی شرم آتی ہے جتنی آپ کو۔"

علی جبران ..... مخدوم پور پہوڑاں

.....○○.....○○.....

ایک صاحب یار دوستوں سے گپیں ہانک رہے تھے کہ باوجود بڑھاپے کے مجھ میں اتنی ہی طاقت ہے جتنی جوانی کے عالم میں تھی۔ لوگوں سے ان کی گپ برداشت نہ ہو سکی تو پوچھا،

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میرے گھر میں ایک پتھر ہے جسے جوانی میں اٹھانے کی بہت کوشش کرتا تھا۔ کامیابی نہیں ہوتی۔ چند دنوں کی بات ہے میں نے وہی پتھر اٹھانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری قوت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اتنی ہی طاقت ہے جتنی کے عالم شباب میں تھی۔"

نوید اختر..... کراچی

.....○○.....○○.....

ایک جگہ جلسہ ہو رہا تھا۔ لیڈر تقریر کر رہا تھا۔

"مجھے محنت و مشقت پسند ہے۔ میں اکثر درخت کے نیچے سائے میں بیٹھ کر سارا سارا دن لوگوں کو محنت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔"

محمد عاقل احمد خان ..... پرانا سکھر

کاروبار میں ایک بہت بڑی کامیابی کے بعد ایک بزنس مین اپنے خیالات میں گم سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں اتنا مگن تھا کہ اس کی نظریں آسمان پر تھیں اور اسے اپنے گردوپیش کا بالکل ہوش نہ تھا۔

چوراہے پر وہ پہنچا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار کار اس کے برابر سے گزری اور ذرا آگے جا کر رک گئی، پھر اس کار کے ڈرائیور نے بزنس مین سے چلا کر کہا۔

"سنئے! اگر آپ وہاں نہیں دیکھیں گے جہاں آپ جا رہے ہیں تو پھر وہاں پہنچ جائیں گے جہاں آپ دیکھ رہے ہیں۔"

.....○○.....○○.....

ایک شاعر نے اپنی نظم چھپوانے کے لئے بھیجی جس کا عنوان تھا۔

"میں کیوں زندہ ہوں۔" نظم لوٹ کر واپس آئی۔ مدیر نے لکھا تھا۔ "اس لئے کہ

آپ نے یہ نظم ڈاک کے ذریعے بھیجی تھی۔"

عبدالمتین..... حسین آباد

.....○○.....○○.....

جارج برنارڈ شا کو ایک نقاد مسلسل چند روز تک خط لکھتا رہا جس میں برنارڈ شا کی تحریروں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ ایک روز برنارڈ شا نے اسے خط لکھا "اپنی تحریروں کے بارے میں خود میری بھی وہی رائے ہے جو آپ کی ہے لیکن لاکھوں پڑھنے والوں کے خلاف میں اور آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔"

.....○○.....○○.....

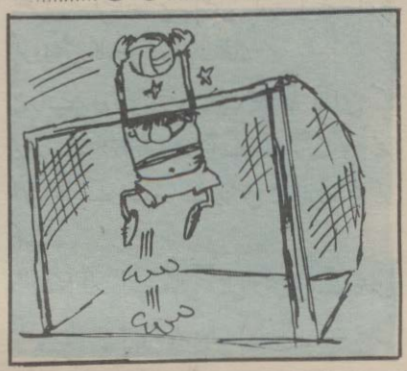

ایک لیڈر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت مغرور ہے۔ ایک دفعہ وہ تقریر کرنے ایک گاؤں میں گیا اور کہنے لگا "لوگ خواہ مخواہ مجھے مغرور کہتے ہیں، اگر میں مغرور ہوتا تو آپ جیسے نچلے درجے اور دو ٹکے کے آدمیوں کے پاس آتا؟"۔

(سید خالد بخاری، گھوٹکی)

کنور مہندر سنگھ بیدی ایک مشاعرے کی کمپیئرنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے فنا نظامی کانپوری کو بلاتے ہوئے کہا "اب میں دعوت کلام دیتا ہوں، چوٹی کے شاعر جناب فنا نظامی کانپوری کو۔ جناب فنا نظامی صاحب"۔

فنا نظامی نے اپنی دراز ریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سردار جی! چوٹی کے شاعر تو آپ ہیں، میں تو صرف داڑھی کا شاعر ہوں۔"

.....○○.....○○.....

آئن اسٹائن کہا کرتا تھا کہ میں نے ہمیشہ مدلل اور منطقی جوابات بچوں سے سنے۔" ایک روز میں نے ایک پانچ سالہ بچے سے پوچھا کہ جب پانی ابلتا ہے تو اس میں سے قلقل کی آواز کیوں آتی ہے؟"

بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا "یہ ان جراثیموں کی چیخیں ہوتی ہیں، جو پانی ابلنے سے جل مرتے ہیں۔"

ستارہ انجم شیخ..... ٹنڈو آدم

پھلوں کا مشاعرہ

پروفیسر عنایت علی خان

آواز نمبر۱۔ بچو! آپ نے مشاعرے تو سنے اور دیکھے ہوں گے۔ آج ہم بھی آپ کو ایک مشاعرہ سنواتے ہیں لیکن یہ مشاعرہ انسانوں کا نہیں پھلوں کا ہے۔ اس میں مختلف پھلوں کو اپنا کلام سنانے کی دعوت دی جائے گی۔ ہر پھل اپنے اشعار میں اپنی پہچان بتائے گا اور پھر آپ لوگ اس کی پہچان سن کر اس کا نام بتائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ اس مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعراء کا کلام پسند کریں گے اور انہیں خوب خوب داد دیں گے۔

آواز نمبر۲۔ اب آپ مشاعرہ شروع بھی کریں گے یا تقریر ہی کرتے رہیں گے!

آواز نمبر۱۔ جی نہیں میری تقریر ختم ہوگئی اب آپ اپنے پسندیدہ پھلوں سے ان کا کلام سنئے اور ان کا نام بتایئے۔ سب سے پہلے میں جناب گول مٹول صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور اپنا کلام عطا فرمائیں۔

گول مٹول: حضرات انسانوں کے مشاعروں میں تو شروع میں چھوٹے موٹے شاعروں کو بلایا جاتا ہے بعد میں اونچے شاعروں کو لیکن پھلوں کے مشاعرے میں شائد اس کے خلاف ہوتا ہے تبھی تو مجھ جیسے بڑے شاعر کو شروع میں بلایا گیا ہے۔

آواز۔ بڑا تو تربوز اور گرما ہوتا ہے آپ تو چھوٹے ہی نظر آرہے ہیں۔ اپنا کلام تو سنایئے۔

گول مٹول: جی ہاں سنیئے۔ عرض کیا ہے:

میں زرد ہرا اور لال بھی ہوں فولاد سے مالا مال بھی ہوں

آواز۔ رنگ بدلنے میں استاد ہو!

گول مٹول: جی ہاں اور سنیئے:

میں خوشبو اور خوش رنگ بھی ہوں اور باغ میں سب کے سنگ بھی ہوں

آواز۔ حضرت آپ باغ میں رہتے ہیں، کہیں باغی تو نہیں ہیں؟

گول مٹول: جی نہیں باغی نہیں باغ کی زینت ہوں۔

آواز۔ آگے ارشاد فرمایئے۔

گول مٹول: جی ہاں، عرض کیا ہے:

خوش رنگ بھی ہے اور خوشبو بھی گو بھائی میرا آڑو بھی ہے
پر ترشی اس کی بات میں ہے شیرینی میری ذات میں ہے

آواز۔ اپنے منہ آپ میاں مٹھو!

آواز۔ بھائی کی غیبت کر رہے ہو۔

گول مٹول: غیبت نہیں حقیقت ہے۔

آواز۔ حقیقت بھی تو پیٹھ پیچھے غیبت ہی ہوتی ہے۔

گول مٹول: خیر میں معذرت چاہتا ہوں۔ آگے سنئے:

گر مجھ کو کچا کھاؤ گے تو بے حد کھٹا پاؤ گے

آواز۔ کھٹے تو انگور ہوتے ہیں!

گول مٹول: وہ لومڑیوں کے لئے ہوتے ہیں۔ آپ تو انسان ہیں۔

آواز۔ مکرر ارشاد یعنی دوبارہ پڑھئے۔

گول مٹول: آداب عرض:

گر مجھ کو کچا کھاؤ گے تو بے حد کھٹا پاؤ گے
ہاں پک جاؤں تب کھاؤ تم بازار سے ڈھیروں لاؤ تم

آواز۔ پیسے تم دو گے؟

گول مٹول: شعر سماعت فرمایئے:

یہ کس نے کہا انیس ہوں میں ہاں سارے پھلوں میں بیس ہوں میں

اور بیس ہی میرا کام بھی ہے اور میرا الٹا نام بھی ہے
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم پھر خوب مزے سے کھاؤ تم

آواز۔ بیس کا الٹا تو سیب ہوتا ہے۔ تو آپ حضرت سیب تھے۔

آواز۔ حضرات آپ ابھی حضرت سیب کشمیری سے ان کا کلام سن رہے تھے۔ اب میں اگلے شاعر کو دعوت کلام دیتا ہوں۔

آپ چمن سے تشریف لائے ہیں۔

شاعر۔

میں اللہ کی اک نعمت ہوں ہاں نعمت کی اک صورت ہوں
میں لال ہرا اور کالا ہوں اور باغ کے دل کا چھالا ہوں

آواز۔ لال ہرا اور کالا، گویا آپ بھی رنگ بدلنے میں ماہر ہیں۔

شاعر۔ جی، اتنا ہی نہیں اور بھی سنئے۔

چھوٹا بڑا بھی منجھلا بھی کھٹا کھٹ مٹھا میٹھا بھی
لمبا موٹا اور گول بھی ہوں میں طاقت کا کیپسول بھی ہوں
یہ کس نے کہا لنگور ہوں میں ہاں لومڑیوں سے دور ہوں میں
وہ دور سے تکتی رہتی ہیں اور کھٹا مجھ کو کہتی ہیں
کمزور مریض جو پاتا ہوں میں پوڈر بھی بن جاتا ہوں
ہم مل کر رہتے ہیں ایسے جھرمٹ میں ستارے ہوں جیسے
اوروں کے لئے دکھ سہتا ہوں سوکھوں بھی تو میٹھا رہتا ہوں
انسان ہو تم لنگور نہیں پھر نام بھی میرا دور نہیں
میں کیا ہوں یہ بتلاؤ تم اور پھر چن چن کر کھا جاؤ تم

آواز۔ لنگور کا قافیہ انگور!

آواز۔ نمبرا۔ جی ہاں یہ تھے جناب انگور چمن آبادی، جو آپ کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ امید ہے آپ نے ان کا کلام پسند کیا ہوگا۔ اب میں قندہار سے آئے ہوئے مہمان شاعر کو دعوت دیتا ہوں کہ تشریف لائیں اور ہمیں اپنا کلام سنائیں۔

شاعر۔

گو سر پہ تاج رکھے الٹا لٹک رہا ہوں . آنکھوں میں دشمنوں کی پھر بھی کھٹک رہا ہوں
بادِ صبا کے جھونکے مجھ کو جھلا رہے ہیں پیڑ کا میں دل ہوں ہر دم دھڑک رہا ہوں
موتی بکھر پڑیں گے گر کھلکھلا کے ہنس دوں شاخِ شجر ہے جھولا جس پر لٹک رہا ہوں
کوزے کی شکل میں تھا پہلے اور اب ہوں شربت بوتل کی گود میں بھی چم چم چمک رہا ہوں

شاعر۔
رنگت میں آگ ہوں میں فطرت میں ہوں میں شبنم گلنار بن کے گلشن گلشن دمک رہا ہوں

آواز۔ گلنار یعنی گلِ انار!

آواز نمبرا جی ہاں۔ آپ نے صحیح پہچانا یہ تھے جناب انار قندھاری اور اب اگلے شاعر کو سماعت فرمائیے:

شاعر۔
کہتا ہے کون اکیلا ہوں ہاں گچھے میں البیلا ہوں

آواز۔ ہمیں تو رنگیلے لگ رہے ہیں۔

شاعر۔
ہر ہجولی کا ماں جایا ہاتھی کے کان کا ہمسایہ

آواز۔ ہاتھی کی سونڈ سے بچ کر رہنا۔

شاعر۔

میں رحمت کا ہوں اک جلوہ قدرت کی پیکنگ میں حلوہ
اوپر سے یہ نکٹائی ہوں اندر سے دودھ ملائی ہوں
میں سبز لباس میں بڑھتا ہوں بھٹی میں پیلا پڑتا ہوں
چھیلو تو قابل دید ہوں میں صورت میں ہلال عید ہوں میں
جب کپڑے اترتے پاتا ہوں جھٹ سے منہ میں چھپ جاتا ہوں
میں کون ہوں یہ بتلاؤ تم پھر چھلکا چھیل کے کھاؤ تم

آواز۔ کیلا پھر ے اکیلا۔

آواز نمبرا۔ جی ہاں، آپ نے صحیح پہچانا یہ تھے جناب کیلا ٹھٹھوی لیکن ابھی آپ انہیں نہ کھائیں۔ یہ ہمارے مہمان ہیں۔ جنہیں یہ پسند ہوں وہ فروٹ مارکیٹ میں ان سے ملاقات کریں۔

اور اب آپ ایک بھاری بھرکم شاعر کا کلام سنئے۔

یہ سبیلہ سے تشریف لائے ہیں:

شاعر۔

پہلے ہمارے بیٹھنے کے لئے جگہ۔ تو بتاؤ۔ پھر ہم سے ہمارا احوال سنو!

آواز نمبرا۔ جی ہاں تشریف لایئے۔ ارشاد!

شاعر۔

گرمی کے دنوں میں آتا ہوں اور سب کی پیاس بجھاتا ہوں
کیا خوب ہے میری رنگت بھی یہ دوزخ بھی ہے جنت بھی

آواز۔ واہ واہ سبحان اللہ دوزخ بھی ہے جنت بھی یعنی سبز بھی ہے اور سرخ بھی۔ مکرر ارشاد۔

شاعر۔ آداب عرض۔

کیا خوب ہے میری رنگت بھی یہ دوزخ بھی ہے جنت بھی

شعر ملاحظہ فرمایئے:

میں پتا بھی ہوں پھول بھی ہوں چھوٹا سا سوئمنگ پول بھی ہوں

آواز۔ اس سوئمنگ پول میں نہانے والوں کے جسم پر مکھیاں بھنکیں گی۔

شاعر۔

یہ جینا بھی کیا جینا ہے لبریز لہو سے سینہ ہے

آواز۔ واہ واہ! کیا انداز بیان ہے، لبریز لہو سے سینہ ہے

شاعر۔ اگلا شعر ملاحظہ فرمایئے۔

گو کھل کھل دانت دکھاتا ہوں پر خون جگر ٹپکاتا ہوں

آواز۔ واہ واہ! سبحان اللہ کیا غم ناک انداز بیان ہے:

پر خون جگر ٹپکاتا ہوں

شاعر۔

میں کون ہوں یہ بتلاؤ تم پھر خوب کلیجہ کھاؤ تم

آواز۔ لال ہی لال ہے۔ قدرتی حلال ہے

آواز۔ جی ۔ ۔ یہ تھے جناب تربوز ....ملوی جو اپنا کلام عطا فرما رہے تھے اور اب آپ آج کے مشاعرے کے آخری شاعر کا کلام سنئے جو تلہار سے تشریف لائے ہیں۔

شاعر: پہلے مائیکروفون کو اونچا کرو۔

آواز۔ آپ کو مائیکروفون کی کیا ضرورت ہے آپ تو خود ریڈیو ٹرانسمیٹر بنے ہوئے ہیں۔
آواز۔ کیا بال کٹوانے کے لئے پیسے نہیں تھے؟ شاعر: حضرات ملاحظہ فرمایئے:

میں گھیرا ہوں نا گگڑی ہوں بس لمبی سی اک لکڑی ہوں

آواز۔ میاں تم بھی لمبے بنو!

شاعر: اس سے زیادہ کیا لمبا بنوں، پھلوں کی دکان میں مشکل سے سماتا ہوں۔

آواز۔ گنڈیری بن جاؤ! ایک تھال میں سما جاؤ گے!

شاعر: جی ہاں، عرض کرتا ہوں۔

میری اک شکل گنڈیری ہے ہر شخص ہی میرا بیری ہے
تن کھاتے ہیں خوں پیتے ہیں سب میرے بل پر جیتے ہیں
گڑ بیٹا شکر بیٹی ہے پر قسمت میری ہیٹی ہے

آواز۔ واہ واہ، آپ ماشاء اللہ صاحب اولاد بھی ہیں۔

شاعر۔

گو سخت یہ میری کھال بھی ہے پر میری گرہ میں مال بھی ہے
نا پھول کھلے نہ پھل نکلے بس آنکھ لگی اور چل نکلے

آواز۔ بھئی یہ آنکھ لگنا بھی خوب ہے۔

شاعر: جناب آنکھ لگنا کونپل پھوٹنے کو کہتے ہیں جس کے بعد گنا توڑ لیا جاتا ہے۔

ہر وقت یہ کھٹکا ہوتا ہے اب میرا جھٹکا ہوتا ہے
سر میرا بیل چبائیں گے تن کولہو میں پلوائیں گے
گو یوں بھی جان گھلانا ہے پانی پانی ہو جانا ہے
لیکن جب منہ لگ جاتا ہوں تب لب کے دل کو بھاتا ہوں
گو جان سے اپنی جاتا ہوں منہ تو میٹھا کر جاتا ہوں
میں کولہو ہوں یہ بتلاؤ تم پھر گڑ اور شکر کھاؤ تم

آواز۔ گنا، گنا!

آواز نمبرا۔ جی ہاں یہ تھے جناب گنا تلمہاری، جو آج کے مشاعرے کے آخری شاعر تھے۔ مجھے امید ہے آپ نے اس پھلوں کے مشاعرے کو پسند کیا ہو گا اور آپ کے منہ میں پانی بھر آیا ہو گا۔ ہم اس میں شریک ہونے والے تمام شعرائے کرام کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ حافظ۔

پاکستان کا علاقائی ادب

مرسلہ:۔ شاہد انور شیرازی، مردان

(۱) ..... سندھی ادب کا پاسر کسے کہتے ہیں؟

(۲) ..... پشتو زبان کا حافظ شیرازی کس شاعر کو کہتے ہیں؟

(۳) ..... پنجابی زبان میں آزاد شاعری کے بانی کون تھے؟

(۴) ..... سرائیکی زبان کے سب سے مشہور شاعر خواجہ غلام فریدؒ کہاں سے تعلق رکھتے تھے؟

(۵) ..... "گلبانگ" بلوچی زبان کے مشہور شاعر کی بلوچی نظموں کا مجموعہ ہے۔ شاعر کا نام بتایئے؟

(۶) ..... سندھ کے مشہور صوفی شاعر عبداللطیف بھٹائی کی پیدائش کے وقت سندھ میں کس خاندان کی حکومت تھی؟

(۷) ..... پشتو شاعری کے مشہور شاعر خوشحال خان خٹک کہاں پیدا ہوئے تھے؟

(۸) ..... "رات دی بات" پنجابی زبان کی نظموں کا مجموعہ ہے، شاعر کا نام بتایئے؟

(۹) ..... مشہور مجلّہ "قند" کہاں سے شائع ہوتا تھا؟

(۱۰) ..... مشہور جواں سال شاعر محمد ابراہیم پاکستان کی کس مشہور علاقائی زبان کے شاعر ہیں؟

مسلم ادب

(۱) ..... مشہور ایرانی اخبار "باختر امروز" کے اس ایڈیٹر کا نام بتایئے۔ جو ایران کے وزیر خارجہ بھی رہے، اور ۱۹۵۴ء میں انہیں پھانسی دی گئی؟

(۲) ..... انڈونیشی زبان میں پہلا ناول کب شائع ہوا؟

(۳) ..... مشہور فارسی شاعر خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی نے حافظ تخلص کیوں رکھا تھا؟

(۴) ..... بنگالی زبان کے اس مشہور شاعر کا نام بتایئے جو فوج میں بھی تھے؟

(۵) ..... عربی زبان کے اس مشہور افسانہ نگار کا نام بتایئے جو ۱۸۹۴ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے پچاس برس تک عربی زبان میں مختصر افسانے تحریر کرتے رہے، اور ان کا انتقال ۱۹۷۳ء کو نوران (سوئٹزرلینڈ) میں ہوا؟

(۶) ..... دنیائے اسلام کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار کا نام بتایئے؟

(۷) ..... ایران کے اس مشہور شاعر کا نام بتایئے جو چھ مرتبہ پارلیمنٹ کے رکن بنے؟

(۸) ..... "مقدمہ ابن خلدون" کے مصنف کون تھے؟ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

(۹) ..... مشہور ادیب "خلیل جبران" کا تعلق کس ملک سے تھا؟

(۱۰) ..... بابر کی مشہور کتاب "تزک بابری" کس زبان میں لکھی گئی تھی؟

جوابات پاکستان کا علاقائی ادب

(۱) شاہ عبداللطیف بھٹائی (۲) رحمٰن باباکو (۳) پروفیسر پورنی سنگھ (۴) چاچڑاں شریف (رحیم یار خان) (۵) گل خان نصیر (۶) کلہوڑو خاندان (۷) ملک پورہ (ضلع نوشہرہ) (۸) فیض احمد فیض (۹) پریمئر شوگر ملز مردان (۱۰) بلوچی۔

جوابات مسلم ادب

(۱) ڈاکٹر حسین فاطمی (۲) ۱۹۳۹ء (۳) اسلئے کہ وہ قرآن پاک کے حافظ تھے (۴) قاضی نذر الاسلام (۵) محمود تیمور (۶) حریت (۷) محمد تقی بہار (۸) ابن خلدون (۱۳۳۲ء تیونس) (۹) لبنان (۱۰) ترکی۔

رابطہ

عامر یوگندھر

دوسرا اور آخری حصہ

"میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارا کیا ہوا..... اور تم خود ہی آ گئے ....." ڈاکٹر شکیل نے کہا۔ امجد نے ایک لمبا سانس لیا اور مریضوں کی مسہری پر لیٹ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کس طرح شروع کرے۔

"ڈاکٹر صاحب ..... مجھے یہ خفیہ رکھنا تھا ..... انتہائی خفیہ ..... لیکن ....." امجد خاموش ہو گیا۔

"کیا خفیہ رکھنا تھا" ..... ڈاکٹر شکیل نے پوچھا اور امجد بولنا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر شکیل کی نظریں امجد کے چہرے پر گڑیں ہوئی تھیں وہ پلک جھپکائے بغیر امجد کو گھورے جا رہے تھے۔

"پتہ نہیں مجھے آپ کو بتانا چاہئے تھا کہ نہیں لیکن میں اب پاگل ہو جاؤں گا..... اب وہ کئی دنوں سے کئی گھنٹوں تک فون کی گھنٹی بجاتا رہتا ہے اور بات تک نہیں کرتا۔"

ڈاکٹر شکیل امجد کو دیکھتے رہے۔

"تم اس پر یقین کرتے ہو....." انھوں نے امجد سے پوچھا..... "کیا تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو....."

امجد سوچ میں پڑ گیا۔

"میں..... میں فون کی گھنٹی سنتا ہوں..... میں اس کی باتیں سنتا تھا میں کس طرح سمجھاؤں....." امجد بولا۔

"امجد..... یہ پاکستان ہے..... شاید ہالی ووڈ کی فلموں میں اس طرح دکھایا جاسکتا ہو گا..... لیکن یہاں تو ایسا کوئی سائنس دان سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر کیا تم حکومت کے اس..... اس خفیہ منصوبے پر یقین کر سکتے ہو....."

ڈاکٹر شکیل کہہ رہے تھے اور امجد کو احساس ہو رہا تھا کہ یہ بات کتنی احمقانہ ہے۔

"لیکن..... لیکن..... میں اس کی آواز سنتا ہوں....." امجد نے روہانسا ہو کر کہا۔ "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دماغ میں آواز، باتیں سننا پاگل پن کی علامات میں سے ایک ہے....."

..... ○ ..... ○ .....

امجد نے چائے کا گھونٹ لیا اور سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی پاگل ہو گیا تھا ڈاکٹر شکیل نے کہا تو تھا..... پھر..... نہیں انھوں نے بعد میں کہا تھا کہ اکیلے پن اور دماغی پریشانی کی وجہ سے بعض لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کوئی ان سے باتیں کر رہا ہو دراصل ان کا دماغ ان کے اکیلے پن اور پریشانی کی وجہ سے بھٹک رہا ہوتا ہے اور وہی یہ باور کرانے لگتا ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔"

"میرا دماغ مجھے بھی یہ باور کرانے لگے گا کہ جیسے وہ کوئی حکومت کا خفیہ ایجنٹ ہے....." امجد نے ڈاکٹر شکیل سے سوال کیا تھا۔

"دماغ مختلف پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے ہزاروں بہانے ڈھونڈ سکتا ہے....." ڈاکٹر شکیل نے جواب دیا تھا۔ کیا ڈاکٹر شکیل صحیح کہہ رہے تھے..... امجد سوچوں میں گم تھا کیا ہو سکتا ہے کیا نہیں..... اس کا دماغ واقعی پریشان تھا.....

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ امجد نے اصل فون کو دیکھا۔ اس کا کنکشن ٹوٹا ہوا تھا۔ فون کی گھنٹی اس کے دماغ میں ہی بج رہی تھی۔ چند منٹ تک وہ یونہی رہا پھر اس نے خیالی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو....." اس نے کہا۔

"ہم تم سے انتہائی مایوس ہوئے ہیں امجد....." دوسری طرف سے آواز نے بہت غصے سے کہا..... ہم نے تمہیں بہت منع کیا تھا کہ اس بات کا کسی کو نہیں پتہ چلنا چاہئے..... یہ حکومت کا خفیہ راز ہے

..... تمہیں سمجھایا تھا کہ نہیں ..... " آواز کرخت ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود تم نے ڈاکٹر کے سامنے سب اگل دیا۔

"امجد کو محسوس ہوا جیسے اس کے پھیپھڑوں سے ہوا نکل گئی ہو "تمہیں..... تمہیں کس طرح پتہ چلا" ..... اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"تم سوچ سکتے ہو..... جب ہم تمہاری آواز سن سکتے ہیں تو پھر..... "

آواز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور امجد جھرجھری لے کر رہ گیا "پھر تم کو یہ بھی پتا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کیا کہتے ہیں ..... " امجد نے ہمت کر کے کہا۔

"بالکل..... وہ کہتے ہیں کہ میں ایجنٹ ٹو ایکس زیرو نہیں ہوں ..... میں حکومت کے خفیہ ادارے میں کام نہیں کرتا..... بلکہ میں تمہارا دماغی فتور ہوں ..... تمہارا لاشعور ہوں ..... جو تم سے اٹکھیلیاں کر رہا ہے ..... خدا کا خوف کرو امجد..... تمہیں کیا ہو گیا ہے ..... "

امجد کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

"اچھا سنو..... ہمارے خیال میں تم ہمارے کام کے آدمی نہیں رہے لہٰذا تمہارے ساتھ ہم رابطہ ختم کر رہے ہیں ..... جو شخص ذرا سا راز نہیں چھپا سکتا وہ ہمارے بھلا کس کام کا..... اچھا خدا حافظ ..... " اور امجد کا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ دوسری طرف سے ریسیور زور دار انداز میں پٹخا گیا تھا.....

..... ○ ..... ○ .....

"کیا تم اب بھی نہیں سمجھے ..... " ڈاکٹر شکیل نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ دراصل تمہارا لاشعور ہی ہے جو تم سے مذاق کر رہا ہے ..... جو اپنا کھیل ختم ہوتے دیکھ کر تم سے ناراض ہو گیا ہے ..... "

"مگر اس نے تو کہا ہے کہ اب رابطہ ختم ہو گیا ہے ..... " امجد نے پوچھا۔

"نہیں..... میرے خیال میں ایسا نہیں..... وہ رابطہ ختم نہیں کرے گا..... تمہارے لاشعور کو تم سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔ نہ جانے کس طرح تمہارا لاشعور تمہارے شعور سے باتیں کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے ..... شاید تمہاری ذہنی پریشانی اور اکیلے پن کی وجہ سے ..... " ڈاکٹر شکیل نے جواب دیا۔

امجد کا سر گھوم رہا تھا..... شعور لاشعور ..... بات چیت۔

"مگر میں اس سے باتیں ہرگز نہیں کرنا چاہتا ..... " امجد تقریباً چیخ کر بولا "نہیں ..... نہیں..... امجد یہ تو ایک سنہری موقع ہے۔ اپنے لاشعور کی باتوں کو سامنے لاؤ۔ اس سے باتیں کرو۔ تمہاری پریشانیوں اسی طرح حل ہو سکتی ہیں۔ ان کو مزید مت دباؤ..... "

"اور اگر وہ مجھے ستاتا ہی رہا تب ....." امجد نے پوچھا۔
"پھر اس خیالی فون کو ہولڈ کر دو ....."
ڈاکٹر شکیل نے جواب دیا.....

.....○.....○.....

اسی رات جب فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی تو امجد کی حالت غیر تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے .....
"ہیلو۔" امجد نے جی کڑا کر کے بات شروع کی۔
"شکریہ" مجھے بہت افسوس ہے امجد کہ تم کو پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے۔ سوری مجھے معاف کر دو ..... ہاں میں جھوٹ بول رہا تھا..... نہ یہ کوئی خفیہ منصوبہ ہے اور نہ ہی میں حکومت کا خفیہ ایجنٹ۔ میں تو دراصل ایک سائنس دان ہوں اور اپنی اس ایجاد کا تجربہ میں نے تم پر کیا ہے ..... دراصل میں نے ایلی شلرٹ ویو شعاعیں ایجاد کی ہیں جو دماغ میں اثر کرتی ہیں اور الفاظ کا روپ دھار لیتی ہیں جیسا کہ ریڈیو میں ہوتا ہے ..... تم پر میں نے یہ تجربہ کیا اور تمہیں پریشان کیا..... اس کی معافی چاہتا ہوں ....." آواز کہہ رہی تھی اور امجد حیران تھا۔
"بکواس ..... سب بکواس ہے ..... تم پھر جھوٹ بول رہے ہو..... ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے تھے ..... تم میری ذہنی پریشانی ہو..... تم میرا لاشعور ہو جس نے الفاظ کا روپ دھار لیا ہے..... تم..... تم" امجد چلا اٹھا۔
"بیوقوف..... احمق انسان..... تم ہمیشہ سے احمق رہے ہو..... ہاں بچپن سے ہی..... احمق لڑکے ..... تم کب انسان بنو گے..... احمق....."
آواز کا لہجہ بدل گیا اور امجد کی پلکیں تک جھپکنا بھول گئیں۔ وہ یہ آواز پہچانتا تھا..... یہ اس کے مرحوم باپ کی آواز تھی.....
"میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب ....." امجد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا
"ہاں ہاں بولو....." ڈاکٹر شکیل نے کہا۔
"ہمارے گھر میں بچپن سے ہی بہت سختی تھی۔ میری ماں اور میرے والد دونوں ہر وقت مجھے ڈانٹتے اور مارتے پیٹتے رہتے تھے۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی اور تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے اور ہر کام میں مجھ سے آگے تھا..... لاہر وقت مجھے اس کا طعنہ دیتے تھے..... پھر ایک روز میرا بڑا بھائی حادثے کا شکار ہو کر مر گیا..... اس کے بعد سے میرے والدین مجھ کو اور زیادہ ڈانٹنے مارنے لگے جیسے میری وجہ سے ہی میرے بھائی

کا انتقال ہوا ہو..... میں نے اسی وجہ سے پڑھائی بھی ادھوری چھوڑ دی اور آوارہ گردی میں لگ گیا۔ پھر میری ماں کا انتقال ہو گیا..... اور اس کے بعد باپ کا بھی..... اس کے بعد سے میں مختلف کام کر کے گزارہ کر رہا ہوں۔ میں بہت محنت کر کے اب اس مقام پر ہوں..... میرا سیٹھ مجھ سے اب گدھوں کی طرح کام لیتا ہے..... میں ہر وقت فکر مند رہتا ہوں..... بعض اوقات میرا ضمیر بھی مجھے یونہی ملامت کرتا ہے....." امجد بول رہا تھا۔

"لیکن اس سب کا تمہارے آج آنے سے کیا تعلق ہے....." ڈاکٹر شکیل نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب..... مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ کون ہے....."

"ہائیں....." ڈاکٹر شکیل اچھل پڑے..... "کون ہے....."

"وہ آواز..... وہ آواز میرے باپ کی ہے....."

"کیا....." ڈاکٹر شکیل کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔ انھوں نے چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور ٹہلنے لگے۔

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ تمہارے باپ کی روح تم سے باتیں کرتی ہے....." انھوں نے کافی سوچ و بچار کے بعد کہا۔

"بالکل....."

"اچھا..... تو پھر تمہیں اس دفعہ یہ کرنا ہے....." ڈاکٹر شکیل امجد کو سمجھانے لگے۔

..... ○ ..... ○ .....

جس لمحے ہی فون کی گھنٹی بجی امجد نے فوراً خیالی فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو....." امجد نے کہا۔

"افوہ..... آج اتنی جلدی....." دوسری طرف سے آواز آئی۔

"مجھے پتہ ہے تم کون ہو....." امجد نے کہا۔

"اچھا....." دوسری طرف سے بڑی طنزیہ آواز آئی۔

"ہاں ابو....." امجد نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تو بالآخر تم نے مجھے پہچان ہی لیا....." آواز نے ہنس کر کہا۔

"لیکن آپ میرے ساتھ اس طرح کیوں کر رہے ہیں....." امجد روہانسا ہو رہا تھا۔

"کیوں..... کیوں..... تم پوچھتے ہو کیوں تمہیں نہیں پتہ کیوں..... اچھا تو میں بتاتا ہوں کیوں ..... اس لئے کہ تم ایک ناکام ترین انسان ہو..... بالکل ناکام، پھوہڑ، جاہل اور بیوقوف انسان..... تم نے اپنی

زندگی میں ایک دھیلے کا کام نہیں کیا..... تم نے بچپن سے لے کر اب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کیا..... تم نہ پڑھ لکھ سکے اور نہ ہی تم نے ہمیں کوئی سکھ دیئے..... ہمیشہ دکھ ہی دیئے..... اور اب ہمارے مرنے کے بعد بھی تم کچھ نہیں کر سکتے..... تمہارا وہ سیٹھ تمہیں گدھوں سے بدتر رکھتا ہے لیکن تم اس کے پیر چاٹتے ہو..... تم ایک ناکام انسان ہو..... ناکام انسان..... ناکام انسان..... ناکام انسان....."

اس کے باپ کے الفاظ کانوں میں، اس کے دماغ میں گونج رہے تھے اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

.....○.....○.....

"امجد....." ڈاکٹر شکیل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"بہت ہو چکا امجد..... اب تمہیں یہ ناٹک ختم کر دینا چاہئے....."

"کیا مطلب....." امجد نے چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ یہ نہ ہی کسی خفیہ ایجنٹ کی آواز ہے نہ ہی کسی سائنس دان کی اور نہ ہی تمہارے مرحوم باپ کی..... یہ آواز خود تمہاری ہے امجد..... تمہارے لاشعور کی..... تمہارا لاشعور تمہارے ضمیر کی طرح بول اٹھا ہے امجد..... تمام زندگی کی ناکامیوں، پریشانیوں نے اس کو بولنے پر مجبور کر دیا ہے..... تم سمجھتے کیوں نہیں..... وہ کسی کی بھی آواز بن سکتا ہے..... میری..... تمہارے باپ کی تمہاری ماں کی..... لیکن وہ دراصل تمہاری ہی آواز ہے تمہارے لاشعور کی آواز..... وہ تمہیں تمہاری ناکامیوں پر طعنے مار رہا ہے....."

ڈاکٹر شکیل کی بات امجد کے دل میں گھر تو کر رہی تھی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

"پھر میں کیا کروں....." امجد نے سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

"مقابلہ..... ہاں..... تم اپنے لاشعور سے مقابلہ کرو..... اس کو اپنی زندگی پر حاوی ہونے نہ دو..... اپنے شعور کو حاوی کرو..... شعور سے لاشعور کو مات دو امجد....." ڈاکٹر شکیل نے کہا۔

"کاش..... کاش میں تھوڑا آرام کر سکتا..... کاش میں آرام کی نیند سو سکتا پھر اس کے بعد میں کچھ بھی کر سکتا ہوں..... ہاں..... کچھ بھی....." امجد نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"ہاں اس سلسلے میں تمہاری مدد میں ضرور کر سکتا ہوں..... یہ لو نیند کی گولیاں..... سونے کے لئے کھالینا..... مگر خیال رکھنا زیادہ مت کھالینا اور ہاں..... اپنے لاشعور کو شعور پر حاوی مت ہونے دو..... وہ پاگل ہو گیا ہے..... ہاں امجد..... پاگل تم نہیں تمہارا لاشعور ہے..... وہ تمہیں شکست دینا چاہتا ہے....."

تمہیں بالکل ناکام کر دینا چاہتا ہے .....

اور امجد نے ڈاکٹر شکیل کے ہاتھ سے گولیاں جھپٹ لیں .....

..... ○ ..... ○ .....

تم مجھے کبھی ناکام نہیں کر سکتے ..... " امجد نے زور سے کہا آج پھر اس نے گھنٹی بجتے ہی خیالی فون اٹھالیا تھا۔

" تم ویسے ہی ناکام ہو ..... بے کار ہو ..... احمق ہو امجد ..... " اس کے باپ کی آواز آئی۔

" یہ بہروپ بھرنا بیکار ہے ..... تم میرے باپ نہیں ہو۔ مجھے پتہ ہے ..... تم صرف میرے لاشعور ہو ..... تم مجھے تنگ نہیں کر سکتے ..... میں اب تمہارا مقابلہ کروں گا ..... " امجد نے کہا۔

" میں ..... تمہارا لاشعور ..... تم میرا مقابلہ کرو گے " دوسری طرف سے قہقہہ کی آواز سنائی دی۔

" بس کرو، کھیل ختم ہو چکا۔ " امجد چیخا وہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ " میری ناکامی کے دن ختم ہو گئے۔ میں اب بدل چکا ہوں اور تم شاید نہیں جانتے کہ انسان کے ارادے میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ ادھر دیکھو میری طرف میرے ہاتھوں میں پستول ہے میں اس سے تمہیں ہلاک کر دوں گا۔ اور تم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاؤ گے۔ " امجد بولتے بولتے رکا۔ پھر پستول کا زور دار دھماکہ اس کے ذہن میں گونجا دوسری طرف سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اگلی صبح امجد بیدار ہوا تو اس کی طبیعت ہشاش بشاش تھی اور اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ چکا تھا۔

ذہین ترین

ایک مرتبہ ایک جہاز میں ایک اسکاؤٹ، ایک بوڑھا اور برطانیہ کا ذہین ترین آدمی سوار تھے کہ اچانک جہاز میں فنی خرابی ہو گئی۔ جہاز میں چار آدمی تھے اور پیراشوٹ تین تھے۔ پائلٹ اور برطانیہ کے ذہین ترین آدمی نے ایک ایک پیراشوٹ اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے ملک کو ہماری بہت ضرورت ہے جہاز سے کود گئے۔ بوڑھا، نوجوان اسکاؤٹ سے کہنے لگا۔ " میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں تم کوئی کارنامہ انجام دے سکتے ہو اس لئے تم آخری پیراشوٹ لے کر کود جاؤ۔ "

" مگر ہمارے پاس دو پیراشوٹ ہیں۔ " اسکاؤٹ نے کہا " برطانیہ کا ذہین ترین آدمی میرا بستہ لے کر کود گیا ہے۔ "

ادیب کی کہانی

سید نیّر مسعود

اگر تم ہندوستان کے شہر لکھنؤ کے میڈیکل کالج والے چوراہے سے تال کٹورے کی کربلا جانے والی لمبی سیدھی سڑک پر چلو تو اکبری دروازے اور نخاس کے تراہوں کے بعد تمہیں وکٹوریا گنج کا چوراہا ملے گا۔ اس چوراہے کی داہنی ڈھلوان سڑک دین دیال روڈ ہے جو شہر کے پرانے محلوں کو جاتی ہے۔ اس سڑک کی ڈھال ختم ہوتے ہی تمہیں داہنے ہاتھ پر سفید رنگ کا ایک بڑا مکان دکھائی دے گا جس پر اس کا نام "ادبستان" لکھا ہوا ہے۔ یہ مکان پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ہے جو اردو کے مشہور لکھنے والے تھے اور سب ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن یہ شہرت اور عزت انہیں اپنے آپ نہیں مل گئی تھی۔ اس کے لئے انہیں کڑی محنت اور محبت کے ساتھ سخت مشکلوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ان کی زندگی کی کہانی سننے کے قابل ہے۔

ادیب ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید مرتضیٰ حسین بہت اچھے حکیم اور بڑے دریا دل آدمی تھے۔ مریضوں سے ان کو جو پیسے ملتے ان میں سے زیادہ تر وہ غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے تھے اور کسی بھی مانگنے والے کو کچھ دیئے بغیر نہیں لوٹاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مانگنے والا آ گیا اور ان کے پاس پیسے نہیں ہوئے تو انہوں نے گھر کے برتن اٹھا کر مانگنے والے کو دے دیئے۔ ان کی اس دریا دلی کی وجہ سے ادیب کی والدہ کو گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو جاتا تھا۔

چالیس سال کی عمر میں حکیم مرتضیٰ حسین کی اچانک وفات ہو گئی۔ ادیب ان کے سب سے بڑے بیٹے تھے اور اس وقت ان کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ اب اس خاندان کو سہارا دینے والا خدا کے سوا کوئی

نہ تھا۔ لیکن ادیب کی والدہ بڑی ہمت والی عورت تھیں۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ جو بھی ہو، وہ اپنے بیٹے کو زیادہ سے زیادہ پڑھوائیں گی۔ شروع میں ادیب کو نیوتنی اور اناو کے قابل لوگوں سے کچھ کتابیں پڑھوائی گئیں۔ ان میں ایک کتاب اتنی موٹی اور بھاری تھی کہ ادیب ان کو آسانی سے اٹھا نہیں پاتے تھے۔ بارہ سال کی عمر میں ان کا نام دور کے ایک گاؤں کرون کے اسکول میں لکھوایا گیا۔ جاڑے کے زمانے میں صبح صبح جب انہیں پیدل اناو سے کرون جانا پڑتا تھا تو سردی سے ان کی انگلیاں ایسی ٹھٹھر جاتی تھیں کہ اسکول پہنچ کر پنسل سے لکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ بڑی محنت سے پڑھتے رہے اور چوتھا درجہ پاس کر کے ان کو تین روپے مہینہ وظیفہ ملنے لگا۔

۱۹۰۶ء میں ادیب کا داخلہ اناو کے ایک اسکول میں ہو گیا وہ اس کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگے جو اصل میں کسی کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا اور اس کی چھتوں اور دیواروں سے ہر وقت چونا جھڑتا رہتا تھا۔ یہاں انہوں نے چھٹے درجے تک پڑھا۔ اس کے آگے پڑھنے کے لئے اناو میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ ادیب کو بہت افسوس تھا کہ ان کی پڑھائی یہیں پر ختم ہوئی جا رہی ہے لیکن اس وقت پھر ان کی والدہ کی ہمت کام آئی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لئے لکھنؤ بھیجنے کا انتظام کر لیا۔ انہوں نے ادیب کو کھانے پکانے کی ترکیبیں لکھوائیں، کئی طرح کے پسے ہوئے مسالوں کی ٹکیاں، کچھ برتن اور تھوڑے سے کپڑے ساتھ کر کے ان کو لکھنؤ روانہ کر دیا تاکہ وہ اس شہر کی کسی مسجد کی کوٹھری میں رہیں، اپنا کھانا خود پکائیں اور کسی اسکول میں نام لکھا لیں۔

۱۹۰۸ء میں ادیب لکھنؤ آ گئے۔ یہاں ان کی ایک خالہ رہتی تھیں جو "خرگوش والی خالہ جان" کہلاتی تھیں اس لئے کہ انہوں نے بہت سے خرگوش پال رکھے تھے جو محلے بھر میں پھدکتے پھرتے تھے۔ وہ اپنی بغل میں اور پیٹ پر کبوتر اور مرغی کے انڈے باندھے رہتی تھیں یہاں تک کہ ان کے بدن کی گرمی پاتے پاتے ان انڈوں میں سے بچے نکل آتے تھے جن کو وہ اپنی اولاد کی طرح پیار کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ وہ گلہریاں بھی پالتی تھیں۔ یہ سب جانور ان کے اوپر اچھل کود کرتے رہتے تھے اور وہ سب کی دیکھ بھال کرتی اور اس طرح اپنا دل بہلاتی تھیں اس لئے کہ ان کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ ادیب کسی مسجد کے بجائے شروع میں انہیں خرگوش والی خالہ جان کے یہاں رہے (بعد میں جب خالہ جان بہت بوڑھی ہو گئی تھیں تو ادیب ان کو اپنے یہاں لے آئے تھے، پھر وہ زندگی بھر "ادبستان" ہی میں رہیں اور یہیں نوے برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔)

ادیب نے لکھنؤ کے حسین آباد ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور جلد ہی ان کی گنتی وہاں کے سب سے اچھے طالب علموں میں ہونے لگی۔ وہیں اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی بھی ان کے ساتھ پڑھتے

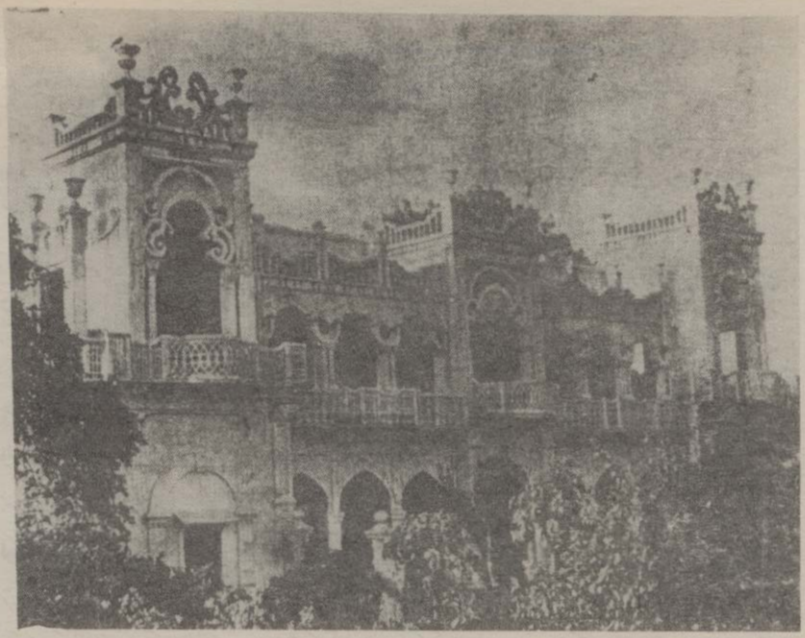

"دلبستان" دین دیال روڈ لکھنؤ پہ مسعود حسن رضوی ادیب کا مکان۔

تھے۔ ابھی ادیب آٹھویں درجے میں تھے کہ ان کے سر میں سخت درد شروع ہوگیا جو سات آٹھ سال تک نہیں گیا۔ لکھنے پڑھنے سے یہ درد اور بڑھ جاتا تھا اس لئے لوگوں نے ان سے کہا کہ پڑھائی چھوڑ دیں لیکن ادیب اس پر تیار نہیں ہوئے۔ بڑی تکلیفیں اٹھا کر انہوں نے ۱۹۱۳ء میں ہائی اسکول پاس کرلیا۔ اسی سال گرمی کی چھٹیوں میں انہوں نے دو جگہ نوکریاں کیں۔ پہلی نوکری افیم کے دفتر میں تھی جہاں ان کی تنخواہ پندرہ روپے مہینہ تھی، اس کے بعد وہ کچہری میں تیس روپے مہینہ پر نوکر ہوگئے۔ اس زمانے کو دیکھتے ہوئے یہ تنخواہ اچھی خاصی تھی اور ہائی اسکول تک تعلیم بھی کافی سمجھی جاتی تھی، اس لئے ان کے کئی عزیزوں نے ان سے کہا کہ اب آگے پڑھنے کا خیال چھوڑ کر یہی نوکری کرتے رہیں اور اپنی والدہ کی مدد کریں جو اپنا زیور اور دوسرا سامان بکوا بکوا کر گھر کا خرچ چلا رہی تھیں۔ لیکن جب ادیب نے اپنی والدہ کے پاس جا کر ان سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے یہ کہہ کر ان کو واپس لکھنؤ بھیج دیا کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے، تم اطمینان سے پڑھے جاؤ۔ اس طرح ادیب کی تعلیم آگے بڑھی اور انہوں نے ۱۹۱۵ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۱۷ء میں بی۔ اے۔ پاس کرلیا۔ بی۔ اے۔ کے بعد انہوں نے ایم۔ اے۔ میں نام لکھایا لیکن پہلے ہی سال میں

ان کو سخت کالرا ہو گیا اور وہ امتحان نہیں دے سکے۔

اس کے کچھ دن بعد ادیب نے الہ آباد میں ایک نوکری کر لی۔ یہاں ان کا کام یہ تھا کہ یو۔ پی۔ کے صوبے بھر میں چھپنے والی ہر کتاب کو پڑھ کر اس کے بارے میں اپنے رائے لکھیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو، ہندی یا انگریزی میں ہوتی تھیں۔ ادیب اردو، فارسی اور انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ ہندی انہوں نے اس وقت تک زیادہ نہیں پڑھی تھی، لیکن اب انہوں نے ایک پنڈت جی کو تنخواہ دے کر ان سے باقاعدہ ہندی سیکھی اور رامائن، پدماوت اور دوسری کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد سے وہ ہندی کی بھی تمام کتابیں آرام سے پڑھ کر ان پر رائے لکھنے لگے۔ اس طرح ادیب نے ساڑھے تین سال کی نوکری میں کئی زبانوں کی دس ہزار سے زیادہ کتابیں پڑھیں جس کی وجہ سے ان کا علم بہت بڑھ گیا۔ ان کی تنخواہ بھی اس زمانے کے حساب سے بہت اچھی یعنی سو روپے مہینہ تھی اور اب وہ اپنی والدہ کی مدد کے لئے ان کو دس روپے مہینہ بھیجنے لگے۔ لیکن ان کی والدہ ان روپوں کو اپنے اوپر خرچ کرنے کے بجائے جمع کرتی رہیں تاکہ بیٹے کو نوکری ملنے کی خوشی میں اسی کی کمائی سے ساری بستی کی دعوت کریں۔

نوکری کے کچھ مہینوں بعد ادیب اپنی والدہ کے پاس نیوتنی گئے۔ وہاں اس زمانے میں انفلوئنزا کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت انفلوئنزا کا علاج آسان نہیں تھا اور روزانہ بہت سے لوگ اس بیماری میں مر رہے تھے۔ ادیب کو بھی نیوتنی پہنچ کر انفلوئنزا ہو گیا اور ان کی دیکھ بھال کرنے میں ان کی والدہ بھی بیمار پڑ گئیں۔ ادیب تیز بخار ہی کی حالت میں الہ آباد واپس آئے اور کچھ دن میں ٹھیک ہو گئے لیکن نیوتنی میں ان کی والدہ کی طبیعت بگڑتی گئی۔ وہاں وبا کا زور اتنا بڑھ چکا تھا کہ گھر گھر موتیں ہو رہی تھیں، یہاں تک کہ مرنے والوں کا جنازہ اٹھانے والے بھی مشکل سے ملتے تھے۔ بازاروں میں سناٹا تھا۔ دوائیں بیچنے والوں نے اپنی دکانیں کھلی چھوڑ دی تھیں۔ لوگ آتے اور خود ہی دواؤں کی پڑیاں باندھ کر لے جاتے تھے۔ جب ادیب کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ پریشان ہو کر الہ آباد سے لکھنؤ آئے کہ یہاں کے کسی اچھے ڈاکٹر یا حکیم سے بات کر کے والدہ کو علاج کے لئے نیوتنی سے لکھنؤ لے آئیں، لیکن ابھی وہ لکھنؤ پہنچے ہی تھے کہ نیوتنی میں ان کی والدہ کی وفات ہو گئی۔ اس طرح ادیب کے سر سے اس محبت کرنے والی ماں کا سایہ اٹھ گیا جس نے بڑے دکھ جھیل کر ان کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھایا تھا۔ وہ ماں کی زیادہ خدمت بھی نہ کر سکے جس کا ان کو زندگی بھر افسوس رہا۔

۱۹۲۲ء میں ادیب کو لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کے لکچرار کی جگہ مل گئی۔ اس یونیورسٹی سے انہوں نے فارسی میں ایم۔ اے۔ کیا اور اسی یونیورسٹی میں وہ بتیس ۳۲ سال تک اردو فارسی پڑھاتے رہے۔ ان کے بہت سے شاگرد آگے بڑھ کر مشہور لکھنے والے بن گئے۔ خود ادیب بھی اپنا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں

گزارتے تھے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن کی وجہ سے ان کا نام دور دور تک پھیل گیا اور ان کو اردو فارسی کا بڑا ادیب اور عالم مان لیا گیا۔

بہت زیادہ پڑھنے لکھنے والوں کے مزاج میں کبھی کبھی روکھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ادیب سے پہلے پہلے ملتے تھے ان کو اس خیال سے تھوڑی جھجھک ہوتی تھی کہ وہ بھی روکھے مزاج کے آدمی ہوں گے۔ لیکن ادیب اتنی اچھی باتیں کرتے تھے کہ سننے والوں کا جی چاہتا تھا وہ گھنٹوں بولے جائیں۔ ان کو طرح طرح کے مزے دار اور حیران کر دینے والے سچے قصے یاد تھے جنہیں ان کی زبان سے سن کر بھلایا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور مشہور شاعروں کے شعر پڑھنے کی نقلیں بھی خوب کرتے تھے۔ تلسی داس کی رامائن کے کئی حصے انہیں زبانی یاد تھے جن کو وہ رامائن کی خاص دھن میں پڑھا کرتے تھے۔ آلھا اودل والی نظم اور بہت سے دیہاتی گیت وہ بالکل دیہاتیوں کی طرح گا کر سناتے تھے۔ اپنے بچوں کے ساتھ کبھی کبھی تاش کھیلتے اور پتنگ اڑاتے تھے۔ ان کے بنائے ہوئے اچار اور مربے سارے خاندان میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ یہ چیزیں وہ خود نہیں کھاتے تھے، بس بنا بنا کر دوسروں کو بانٹ دیتے تھے۔ ان کو طرح طرح کے پھل دار درخت لگانے اور ترکاریاں بونے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے لگائے ہوئے پیڑ پورے پھلتے بھی خوب تھے اور ان کی زندگی بھر "ادبستان" کے باغ میں لیموں، پپیتے، آڑو، امرود، نارنگی، کروندے، شہتوت، کیلے اور بھنڈی، ٹماٹر، بینگن، لوکی، ترئی، سیم، گوبھی وغیرہ کی ریل پیل رہتی تھی، لیکن ان کے مرنے کے تھوڑے ہی دن کے اندر ان کے لگائے ہوئے قریب قریب سارے پیڑ اپنے آپ سوکھ گئے۔

۱۹۶۹ء میں ادیب کی بیوی کی وفات ہو گئی۔ وہ بڑی نیک بی بی تھیں اور ادیب انہیں بہت چاہتے تھے۔ بڑھاپے میں ان کا ساتھ چھٹنے کے بعد سے وہ اداس اور چپ چپ رہنے لگے۔ اسی حال میں چھ سال گزر گئے۔ ۱۹۷۵ء میں ۲۹ جولائی کو جو ادیب کی سالگرہ کا دن تھا، ان کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ پھر وہ بستر سے اٹھ نہیں سکے۔ چار مہینے بیمار رہ کر ۲۹ نومبر ۱۹۷۵ء کو اپنے مکان "ادبستان" میں ادیب کی وفات ہو گئی۔ ان کی قبر وکٹوریا اسٹریٹ پر منشی فضل حسین خان کی کربلا میں ہے۔

ادیب کی زیادہ تر کتابیں بڑوں کے پڑھنے کی ہیں لیکن کچھ چیزیں انہوں نے چھوٹوں کے لئے بھی لکھی تھیں جن کو ایک کتاب "بچوں سے باتیں" میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کو غور سے پڑھو گے تو تم کو بہت سی کام کی باتیں معلوم ہو جائیں گی اور تم خود بھی اچھی اردو لکھنے لگو گے۔ ادیب نے یہ چیزیں اب سے بہت پہلے ۱۹۲۵ء میں لکھی تھیں جب تم، بلکہ تم میں سے بہتوں کے ماں باپ بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس زمانے سے آج کے زمانے میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ اس وقت گھروں میں کولر، فرج وغیرہ

نہیں ہوتے تھے، بجلی کے پنکھے بھی بہت کم گھروں میں تھے۔ لوگ تہہ خانوں، خس کی ٹیٹوں، مٹی کی صراحیوں اور گھڑوں کے ٹھنڈے پانی سے گرمی کا مقابلہ کرتے تھے۔ سواریوں میں پمپو، ٹیکسی، بس بلکہ سائیکل رکشا تک کا پتا نہ تھا۔ لوگ اکوں، تانگوں اور ڈولیوں پر آتے جاتے تھے۔ گیس یا بجلی کے چولھے بھی نہیں تھے۔ مٹی کے چولھے میں لکڑیاں یا انگیٹھی میں کوئلے جلا کر کھانا پکایا جاتا تھا۔ ریلوے انجن اور پانی کے جہاز ڈیزل یا بجلی کے بجائے بھاپ کی طاقت سے چلائے جاتے تھے۔ سکے بھی آج کے سے نہیں تھے۔ ایک روپے میں سولہ آنے، ایک آنے میں چار پیسے اور ایک پیسے میں تین پائیاں ہوتی تھیں۔ دریا اور سمندر سے نکلنے والی کوڑیاں بھی بازار میں سکے کی طرح چلتی تھیں اور ایک پیسے میں بیس، یعنی ایک روپے میں ایک ہزار دو سو اسی (۱۲۸۰) کوڑیاں ہوتی تھیں (اسی لئے بہت سستے داموں کو "کوڑیوں کے مول" کہا جاتا تھا۔) فاصلوں اور لمبائیوں کی ناپ کلو میٹر، میٹر اور سنٹی میٹر کے بجائے میل، فرلانگ اور گز وغیرہ کے حساب سے ہوتی تھی۔ پانچ میل آٹھ کلو میٹر کے برابر اور ایک میل آٹھ فرلانگ یا سترہ سو ساٹھ (۱۷۶۰) گز کا ہوتا تھا اور ایک کوس میں دو میل ہوتے تھے۔ ایک گز میں تین فٹ (قریب نوے سنٹی میٹر) اور ایک فٹ میں بارہ انچ ہوتے تھے۔ وزن کا حساب بھی آج کی طرح کوئنٹل، کلو گرام اور گرام میں نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت سیر ہوتا تھا جس کا وزن ایک کلو گرام سے کچھ کم تھا۔ ایک سیر میں چار پاؤ، ایک پاؤ میں چار چھٹانک، ایک چھٹانک میں پانچ تولے، ایک تولے میں بارہ ماشے اور ایک ماشے میں آٹھ رتی، اور چالیس سیر کا ایک من، اٹھائیس من کا ایک ٹن ہوتا تھا۔ اب تو یہ حساب بڑا لمبا ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں لوگوں کو یہ سب وزن، فاصلے اور سکے رٹے ہوئے ہوتے تھے۔

ادیب کی "بچوں سے باتیں" اسی زمانے کی ہیں جن سے تم کو اس زمانے کا حال اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

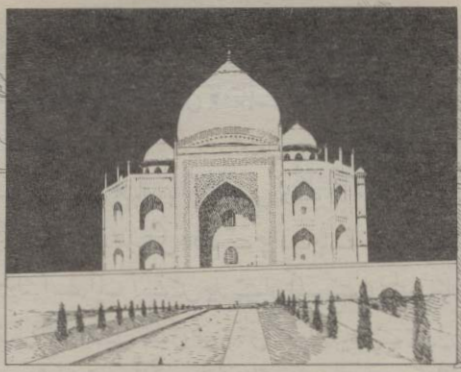

تاج محل

سید مسعود حسن رضوی ادیب ● ۱۹۲۵ء کی ایک نادر تحریر!

ہندوستان میں بڑے بڑے مغل بادشاہ گزرے ہیں مگر شاہ جہاں کی شان و شوکت کو کوئی نہیں پہنچتا۔ یہ اکبر کا پوتا تھا۔ اپنے باپ جہانگیر کے انتقال کے بعد ۱۶۲۸ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس کو عمارتوں کا بہت شوق تھا۔ یوں تو اور مغل بادشاہوں نے بھی اچھی اچھی عمارتیں بنوائی تھیں، مگر شاہ جہاں اس بات میں سب سے بڑھ گیا۔ اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں کا جواب روئے زمین پر مشکل سے ملے گا۔ شاہ جہاں کی عمارتوں میں تاج محل سب سے عمدہ ہے۔ بڑے بڑے سیاحوں نے اس کو دنیا کے عجائبات میں شمار کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں اس سے اچھی عمارت کہیں نہیں ہے۔ تاج محل کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے۔ پہلے اسے سن لو، پھر تاج محل کا حال سننا۔

شاہ جہاں کو اپنی بیوی ممتاز محل سے بہت محبت تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن ممتاز محل سو رہی تھی۔ اس نے خواب میں ایک نہایت خوب صورت عمارت دیکھی۔ عمارت کیا تھی بہشت کا نمونہ تھی۔ آنکھ کھلی تو شوہر سے خواب بیان کیا اور کہا کہ تم مجھے ایک ویسی ہی عمارت بنوا دو۔ شاہ جہاں تھا عمارتوں کا دلدادہ، اور پھر پیاری بیوی کی فرمائش! اس نے جواب دیا کہ جو عمارت تم نے خواب میں دیکھی ہے وہ تو خدا

جانے کیسی تھی، البتہ میں تمہارے لئے ایک ایسی عمارت بنوائے دیتا ہوں جیسی کسی نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو۔

شاہی فرمان ملکوں ملکوں جاری ہوگئے کہ بڑے بڑے انجینئر ایک ایسی عمارت کا نقشہ تیار کر کے بادشاہ کے حضور میں پیش کریں جس سے بہتر عمارت ان کے نزدیک ہو ہی نہ سکتی ہو۔ انجینئروں کی قسمت کھل گئی۔ اچھے سے اچھے نقشے بنا کر پیش کرنے لگے اور سونے چاندی سے جیبیں بھرنے لگے۔ مگر ممتاز محل کی آنکھوں میں تو وہی خواب والی عمارت پھر رہی تھی۔ اسے کوئی نقشہ پسند نہ آیا۔ آخر میں ایک فقیر ایک نقشہ بنا کر لایا۔ ممتاز محل نے اسے دیکھا تو خوشی کے مارے اچھل پڑی اور کہنے لگی "ہاں یہ وہی عمارت ہے جس کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں۔" بادشاہ نے فقیر کو امیر کر دیا اور اسی نقشے کے مطابق تاج محل تیار کروایا۔

خیر یہ قصہ تو بڑے بوڑھوں کی زبانی سننے میں آیا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں یوں لکھا ہے کہ جب چودہ برس کے سہاگ کے بعد ممتاز محل کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے شاہ جہاں سے وصیت کی کہ میرا مقبرہ ایسا بنوانا جس سے میرا نام چلے۔ شاہ جہاں نے یہ وصیت یوں پوری کی کہ تاج محل کی سی بے نظیر عمارت کھڑی کر دی۔

تمام ہندوستان، ایران، عرب اور ترکستان سے بڑے بڑے انجینئر معمار، سنگ تراش وغیرہ بلائے گئے۔ سنگِ مرمر جے پور کی کانوں سے اور سنگِ سُرخ فتح پور سیکری سے آیا۔ قیمتی قیمتی پتھر اور جواہرات دنیا کے گوشے گوشے سے ڈھونڈ کر نکالے گئے اور تاج محل کی بنیاد پڑ گئی۔ بیس ہزار کاریگر اور مزدور روزانہ کام کرتے تھے اس پر بھی اس عالی شان عمارت کو بنتے بنتے تیس برس لگ گئے اس زمانے میں مزدوری بہت سستی تھی جو مزدور ایک آنے روز پر مل جاتا تھا وہ اب آٹھ آنے روز پر بھی مشکل سے ملتا ہے۔ پھر بھی تاج محل میں کوئی تین کروڑ روپے لگ گئے۔

تاج محل دریائے جمنا کے داہنے کنارے پر واقع ہے۔ اگر تم تاج محل دیکھنے جاؤ تو سب سے پہلے سنگِ سرخ کا ایک بڑا سا سہ منزلہ پھاٹک کوئی سو فٹ اونچا ملے گا۔ یہ پھاٹک تاج محل کا صدر دروازہ ہے۔ اس کے بازوؤں پر قرآن شریف کی آیتیں خط طغرا میں لکھی ہوئی ہیں۔ سنگِ مرمر کی زمین پر سنگِ موسیٰ کے حرف ایسے کھل رہے ہیں جیسے آنکھ کی سفیدی میں پتلی کی سیاہی۔ یہ حرف جتنے بڑے نیچے ہیں اتنے ہی بڑے اسّی فٹ کی بلندی پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی صنعت ہے جسے دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس پھاٹک میں اژدھات کا ایک نہایت خوب صورت دروازہ لگا ہوا ہے۔

صدر دروازے سے تاج محل کی عمارت تک پتھر کی دو خوش نما پٹریاں ہیں۔ ان پٹریوں کے بیچ میں

سنگِ سرخ کی ایک نہر ہے جو پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ پھاٹک سے تاج محل کی کرسی تک چلی گئی ہے۔ نہر کے دونوں طرف سرو کے درختوں کی قطاریں ہیں اور بیچوں بیچ میں سنگ مرمر کا ایک بڑا سا حوض ہے۔

نہر میں فوارے جاری ہیں اور حوض میں رنگ رنگ کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔

صدر دروازے سے داخل ہونے کے بعد ایک باغ ملے گا جو نو سو اکھتر فٹ (۹۷۱) مربع ہے۔ اس باغ میں طرح طرح کے خوب صورت خوب صورت درخت لگے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ ایک سیمل کا بہت پرانا درخت بھی لگا ہوا ہے۔ اس کے تنے کا پھیر کوئی انیس فٹ ہے اور اس کی عمر ساڑھے چار سو برس کے قریب پہنچ چکی ہے۔

باغ کو طے کرنے کے بعد سنگ سرخ کا ایک بڑا سا چبوترہ ملتا ہے۔ یہ نو سو پچانوے فٹ لمبا اور تین سو پینسٹھ فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا ہے۔ اس چبوترے پر سنگ مرمر کی کرسی تین سو تیرہ فٹ مربع اور ساڑھے اٹھارہ فٹ بلند ہے۔ اس کرسی کے چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے چار مینار ہیں۔ ہر مینار کی بلندی ایک سو تینتیس فٹ ہے۔ بیچ میں تاج محل کی ہشت پہلو عمارت ہے۔ یہ عمارت بھی خالص سنگ مرمر کی ہے۔ اس کی رو کار پر اور محرابوں میں قرآن شریف کی آیتیں سنگ موسیٰ کے حرفوں میں خطِ طُغرا میں لکھی ہیں۔ ان حرفوں میں بھی وہی صنعت ہے جو پھاٹک کے حرفوں میں تھی۔ زمین سے تاج محل کی چھت ایک سو انتالیس فٹ چھ انچ اونچی ہے۔ چھت کے کونوں پر چار گمٹیاں ہیں اور بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا گنبد ہے۔ اس گنبد کا پھیر اٹھاون فٹ ہے۔ اس کے اوپر ساڑھے تیس فٹ اونچا سنہرا کلس ہے۔ کلس کے سرے پر ایک بڑا سا چاند بنا ہوا ہے۔

تاج محل کے اندر سنگ مرمر کی جالی دار دیواروں کا ایک احاطہ ہے جس کے بیچ میں ممتاز محل کی قبر ہے اور اس کے پہلو میں بائیں طرف شاہ جہاں کی قبر ہے۔ دونوں قبروں پر قرآن شریف کی آیتیں لکھی ہوئی ہیں۔ حقیقت میں یہ صرف قبروں کے نشان ہیں۔ اصلی قبریں ٹھیک انہیں مصنوعی قبروں کے نیچے تہہ خانے میں ہیں۔

تاج محل میں سنگ تراشی، گُل کاری، پچّی کاری، منبت کاری کے ایسے ایسے کام ہیں کہ دنیا کے پردے پر کسی اور عمارت میں نہیں۔ اس کے مینار، گنبد، گمٹیاں، در، محرابیں، غرض ہر چیز گویا سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ سنگ مرمر پر ایسی جِلا کی گئی ہے کہ اس میں موتی کی سی آب پیدا ہو گئی ہے۔ چاندنی رات میں تاج محل کو ذرا دور سے دیکھو تو ایک نور کا قبّہ معلوم ہوتا ہے۔ پتھر میں باریک باریک جالیاں کاٹی ہیں۔ رنگین پتھروں کی پھول پتیاں تراش کر سنگ مرمر کی دیواروں میں پیوست کر دی ہیں۔ کیسی کیسی خوش نما بیلیں بنائی ہیں۔ کوئی سیدھی چلی جا رہی ہے۔ کوئی بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ ان بیلوں میں پھول

اور کلیاں لگائی ہیں۔ کوئی کلی منہ بند، کوئی آدھ کھلی، کوئی کھلا کھلایا پھول ہے۔ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی میں بھی نہ معلوم کتنے جوڑ ہیں۔ ان کی نازک سے نازک رگیں اور باریک سے باریک دھاریاں تک صاف دکھائی گئی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ نہ دیکھنے میں کہیں جوڑ معلوم ہوتا ہے نہ چھو لینے میں کھر کھراپن۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑے ہوشیار مصور نے موقلم سے دیواروں پر بیل بوٹے بنا دیئے ہیں۔ ان سنگ تراشوں میں کہاں کا کمال آگیا تھا اور ان کے ہاتھوں میں کس غضب کی صفائی تھی کہ ان کے حسابوں پتھر نہ ہوا موم ہوا کہ جیسا چاہا تراش لیا۔

تاج محل فنِ تعمیر کا ایک معجزہ ہے۔ نہ زبان اس کی تعریف کر سکتی ہے نہ قلم اس کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس عمارت کو بنے ہوئے پونے تین سو برس ہو چکے ہیں مگر اب بھی وہ آب و تاب ہے کہ گویا آج ہی بن کے تیار ہوئی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ بڑے سے بڑے انجینئر اور کامل سے کامل معمار اس کو دیکھ کر حیرت کے دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔

آخر میں ہم لکھنؤ کے مشہور شاعر حضرت صفی کا ایک شعر لکھتے ہیں جس سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تاج محل کتنی خوب صورت عمارت ہے:۔

دیکھ کر سیر اس کی دنیا سے گزرنا سہل ہے
مقبرہ ایسا جو مل جائے تو مرنا سہل ہے

نیک بخت

نواب سر ذوالفقار علی خان، علامہ اقبال کے بہت گہرے دوست تھے۔ علامہ اقبال جب بھی ان کے گھر جاتے، تو نواب سر ذوالفقار علی خان کے صاحب زادے، جن کی عمر ابھی نو، دس سال کی ہوگی، اپنے گھر سے ملحقہ باغ میں درختوں سے گوند نکالا کرتے۔ علامہ اقبال اکثر ان کے گھر جاتے جاتے ایک مصرع کہہ دیا کرتے تھے۔ "ننھے میاں نے گوند نکالی درخت سے۔"

اور ننھے طنزاً علامہ سے کہہ دیا کرتے "قبلہ آپکی شاعری تو ایک ہی مصرع پر ختم ہو جاتی ہے۔" ایک دن جب ننھے معمول کے مطابق گوند نکال رہے تھے تو اچانک علامہ کی آواز کان سے ٹکرائی وہ کہہ رہے تھے ننھے میاں ہم نے شعر مکمل کر لیا ہے عرض کیا ہے،

ننھے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور انکی شادی ہوگی کسی نیک بخت سے

ننھے میاں اپنی شادی کا ذکر سن کر بہت جھینپے مگر باقی لوگ ہنسنے لگے۔

یہ حقیقت کچھ

سید عقیل عباس جعفری

مغالطہ :۔

دنیا کی سب سے بڑی مچھلی بلیو وہیل ہوتی ہے۔

حقیقت :۔

یہ تو درست ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا جاندار بلیو وہیل ہوتی ہے مگر یہ کہنا درست نہیں کہ بلیو وہیل مچھلی ہوتی ہے۔

غالباً یہ مغالطہ اس لئے پیدا ہوا کہ بلیو وہیل کی بود وباش سمندر میں ہوتی ہے اور سمندر میں پائی جانے والی اس نوع کی مخلوق بالعموم مچھلی سمجھی جاتی ہے۔ جبکہ بلیو وہیل کا شمار سائنسی طور پر مچھلیوں میں نہیں بلکہ ممالیہ جانوروں میں کیا جاتا ہے۔ مچھلیوں میں سب سے بڑی مچھلی کا نام "وہیل شارک" ہوتا ہے۔

وہیل شارک بحراوقیانوس، بحرالکاہل اور بحرہند میں پائی جاتی ہے۔ اس مچھلی کی اوسط لمبائی پانچ اعشاریہ صفر تین میٹر ہوتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مشرق بعید کے سمندروں میں ایک ایسی وہیل شارک پکڑی گئی تھی جس کی لمبائی ساڑھے اٹھارہ میٹر اور وزن ۴۲ ٹن تھا۔

حوالے :۔

(Ref. Don't You Believe It by Gyles Brandreth. P. 98)

مغالطہ :۔

نوری سال وقت کی اکائی ہے۔

حقیقت :۔

نوری سال وقت کی نہیں، فاصلے کی اکائی ہے۔ یہ مغالطہ شاید اس لئے پیدا ہوا کہ اس اکائی کے نام میں لفظ سال شامل ہے۔

نوری سال، اس فاصلے کو کہا جاتا ہے جو روشنی کی ایک شعاع، ایک سال میں طے کرتی ہے۔ یہ فاصلہ ۵۸ کھرب، ۷۸ ارب، ۴۹ کروڑ ۹۷ لاکھ ۷۲ ہزار میل کے مساوی ہوتا ہے۔

حوالے :۔

The Dictionary of Misin formation by Tom Burnam P-157

مغالطہ :۔

ہر سیارے کا سال، اس کے دن سے بڑا ہوتا ہے۔

حقیقت :۔

ہر سیارے کی، جن میں زمین بھی شامل ہے، دو گردشیں ہوتی ہیں۔ ایک گردش سورج کے گرد، جس سے سال وجود میں آتے ہیں، اور ایک گردش اپنے محور کے گرد، جس سے دن اور رات وجود میں آتے ہیں۔ زمین کا ایک سال ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۷ منٹ ۳۸ سیکنڈ پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب کہ ایک دن ۲۳ گھنٹے ۵۶ منٹ ۴ سیکنڈ ہوتے ہیں۔

مگر سیارہ زہرہ اپنے محور کے گرد ایک گردش زمین کے ۲۴۳٫۱۶ دن میں، اور سورج کے گرد، ایک گردش، زمین کے ۲۲۴٫۷۰۰۷ دنوں میں مکمل کرتا ہے اس طرح اس کا دن، اس کے سال سے بڑا ہوتا ہے۔

حوالے :۔

Guinise Book of World Records -1974

By Norris & Ross Mcwhirter P-155

مغالطہ :۔

ریڈیو مارکونی نے ایجاد کیا تھا۔

حقیقت :۔

عام طور پر ریڈیو کی ایجاد کا سہرا اٹلی کے باشندے گگلیلمو مارکونی کے سر باندھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور ہے۔

حقیقت یہ کہ ۱۸۸۸ء میں جرمن سائنس دان ہنرخ ہرٹز نے پہلی مرتبہ برقی مقناطیسی لہروں کے اصول پر دنیا کا پہلا ٹرانسسٹر اور ریڈیو ایجاد کیا تھا۔ چھ برس بعد ۱۸۹۴ء میں اٹلی کے سائنس دان گگلیلمو مارکونی نے ہرٹز ہی کے خطوط پر مزید کام کیا اور اس کی ایجاد کو ایک عملی شکل دے دی۔ ۲ برس بعد ۱۸۹۶ء میں مارکونی نے اپنی اس ایجاد کا عوام کے سامنے مظاہرہ کیا اور جولائی ۱۸۹۷ء میں اس نے وائرلیس ٹیلی گراف اینڈ سگنل کمپنی لمیٹڈ قائم کی جس نے ریڈیو اور ریڈیو اسٹیشن بنانے شروع کئے۔

چونکہ مارکونی نے ریڈیو کی ایجاد کو عوام سے روشناس کرانے اور اسے مقبول بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اس لئے یہ ایجاد اسی سے منسوب ہوگئی۔ حالانکہ یہ جرمن سائنس دان ہنرخ ہرٹز کی ایجاد تھی اب بھی روس میں پڑھائی جانے والی درسی کتب میں "بابائے ریڈیو" کے طور پر ہرٹز کا نام درج ہوتا ہے۔

حوالے :۔

(Ref. Don't You Believe It by Graham & Sylvania Nown. P. 32)

ہمارا گھر

عبدالقادر

ہم اپنے گھر کی، جھلک دکھائیں، کہ بات دل میں، یہی سمائی
ہیں اس چمن کے، یہ پھول سارے، ہماری باجی، ہمارے بھائی
ہمارے دادا کی دھاک سب پر، اُنہیں کا چلتا ہے حکم اکثر
کبھی تھے مانے ہوئے شکاری، اسی سے شہرت بھی خوب پائی
ہماری دادی، بہت ہی پیاری، زبان سے اُن کی، دعا ہے جاری
ہے بات اُن کی، بڑی رسیلی، پسند اُن کی ، ہے رس ملائی
ہماری نانی، بڑی سیانی، سنائے ہر رات، اک کہانی
ذرا جو ٹوکا، تو آیا غصہ، ہمارے سر پر، چپت لگائی
ڈکارتی ہیں، ہماری تائی، ٹھکانہ ان کا ہے چارپائی
وہ گول تکیہ ہے سر کے نیچے، بدن کے اوپر ہے اک رضائی

ہمارے ابو کی جلد بازی، عجب شگوفے کھلا رہی ہے
گئے جو دفتر میں کل سویرے، گلے میں اُلٹی تھی ان کی ٹائی

دوات جلدی میں آج کھولی، گرائی جتنی تھی روشنائی
وہ دیکھو رنگین ہو گئی ہے، قمیص جو تھی سُدھلی دُھلائی

پہن کے جب سوٹ گھر سے نکلے، جدا جدا تھے وہ دونوں موزے
کوئی ہرا تھا، کوئی گلابی، ہوئی تھی پھر خوب جگ ہنسائی

ہماری امی کا دیکھو جلوہ، پکار رہی ہیں کچن میں حلوہ
ہمیشہ کاموں کی دُھن لگی ہے، کبھی سِلائی، کبھی صفائی

چچا ہمارے بڑے غصیلے، ہمیشہ اونچا ہے ان کا پارہ
وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں، سمجھ نہ لینا انہیں قصائی

پھسل کے اُن سے جو ٹوٹی پیالی، ہماری گردن مروڑ ڈالی
ذرا نہ اپنا قصور دیکھا، ہماری ناحق ہوئی پٹائی

بڑی ہی رسیا ہیں ناولوں کی، ہماری باجی کا حال دیکھو
تلا جو انڈا تو کوئلہ تھا، نظر جو ناول سے نہ ہٹائی

ہمارے بھائی نے کھیل ہی میں، جو وقت اپنا فضول کھویا
ہوئے وہ ناکام امتحاں میں، تو شکل دن بھر نہیں بتائی

شرارتوں میں لگا ہے مُنّا، تپائی پر وہ کھڑا ہوا تھا
گرا جو دھم سے تو چوٹ آئی، چڑھا تھا لینے کو وہ مٹھائی

یہ حیرت ناک اور دلچسپ مقابلے

اُم کاشان

ہماری یہ دنیا عجائبات سے خالی نہیں، فطری عجائبات کا تو ذکر کرنا ہی محال ہے۔ اس پر انسانی عجائب! آیئے آپ کو اس دنیا میں پائے جانے والے کچھ انسانی عجائب کے متعلق بتایا جائے۔

آپ نے اپنے اسکول میں سماجی، ثقافتی انجمنوں کے زیر اہتمام مختلف مقابلوں میں حصہ لیا ہوگا یا ایسے مقابلوں میں بطور سامع شرکت بھی کی ہو۔ مگر دنیا کے بیشتر ممالک میں ایسے عجیب و غریب مقابلے ہوتے ہیں جن کے متعلق جان کر آپ یقیناً حیرت میں پڑ جائیں گے۔ مثال کے طور پر جاپان میں ایک مقابلہ چیخنے چلانے کا ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے۔ جو سب سے تیز چیخنے کا مظاہرہ کرے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جو چیخنے کی تیزی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ مشین بالکل اسی قسم کی ہوتی ہے۔ جیسی آپ نے بازاروں میں پھیپھڑوں کی قوت بتانے والی مشین دیکھی ہوگی۔ جاپان میں چیخنے کا ہی نہیں تیز تر آواز میں باتیں کرنے کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔

آسٹریلیا کے ہگ پورٹر نے سات دن تک مسلسل خاموشی اختیار کر کے خاموش رہنے کا نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ شور مچانے کے مقابلے میں کینیڈا

کے مسٹر ڈیوک فلاک کم نہیں۔ یہ ایک مرتبہ مسلسل تیس گھنٹے تک اپنے منھ سے سیٹی بجانے کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ لطائف سنانے کے بے شمار مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ کیلیفورنیا کے مسٹر میکڈونلڈ نے پچپن گھنٹوں تک مسلسل لطیفے سنا کر سامعین کو محظوظ ہی نہیں کیا۔ بلکہ انعام اور شہرت بھی حاصل کی۔ تالی بجانے کے ایک مقابلے میں ۱۶۰ فی منٹ کی اوسط سے تالی بجاتے ہوئے ہمارے پڑوسی ملک کے صوبے تامل ناڈو کے جے رامن نے ۵۴ گھنٹے تک تالی بجانے کا مظاہرہ کر کے اول انعام حاصل کیا۔ گھنٹی بجانے کے ایک مقابلے میں ایک صاحب نے ہاتھ سے ہلا کر بجانے والی گھنٹی بجانے کا ۵۶ گھنٹوں تک مظاہرہ کیا۔ اسی قسم کے ایک انوکھے مقابلے کا کراچی کی طلبہ و فنکاروں کی ایک ادبی، سماجی ثقافتی انجمن بزم ندیم نے ۱۹۶۶ء میں اہتمام کیا تھا۔ اس مقابلے میں خواتین کو بتی والے چولہے پھونک مار کر بجھانے کا مظاہرہ کرنا تھا جسے اردو محل ابتدائی ثانوی اسکول کی ایک طالبہ نے صرف ایک پھونک مار کر بجھا دیا تھا۔ اور یوں وہ اول انعام کی مستحق قرار پائی تھی۔

اشیاء کو زیادہ سے زیادہ فاصلے تک پھینکنے کے بھی بے شمار مقابلے ہوتے رہتے ہیں ایک شخص نے ۱۸۵ فٹ کے فاصلے تک تاش کے پتے پھینک کر ریکارڈ قائم کیا تھا۔ بیر و بال کو ۴۴۵ فٹ دور تک پھینکنے کا عالمی ریکارڈ ہے۔ جب کہ ۵ پونڈ وزن کی اینٹ کو جیولف کیپس ۱۴۶ فٹ تک پھینکنے کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

انڈوں کی مدد سے بھی کئی مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں۔ مثلاً انڈا و چمچہ ریس۔ اس ریس میں ایک چمچہ دانتوں میں دبا کر اس میں انڈا رکھ کر ریس میں حصہ لیا جاتا ہے۔ اس ریس میں وہی کھلاڑی فاتح قرار پاتا ہے جو چمچے میں سے انڈا گرائے بغیر سب سے پہلے نشان زدہ جگہ پر پہنچ جائے اس ریس کا سب سے دلچسپ ترین مظاہرہ ایک کھلاڑی نے ۴ گھنٹے، ۳۴ منٹ تک مسلسل دوڑ کر پیش کیا۔ انہوں نے اس مدت میں ۲۸ میل کا فاصلہ طے کیا اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ اتنی طویل ریس میں ان کے چمچے میں رکھا ہوا انڈا ایک بار بھی نیچے نہیں گرا۔ اسی طرح انڈے کو بغیر توڑے ہوئے زیادہ سے زیادہ فاصلے تک پھینکنے کا بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ ایسے ایک مقابلے میں ایک کھلاڑی نے ۳۱۷ فٹ کے فاصلے تک انڈا پھینکنے کا پہلا انعام حاصل کیا۔ "انڈا تلاش کرو" مقابلے میں دس ہزار افراد نے حصہ لیا۔ ایک بڑے میدان میں ۷۲ ہزار مرغیوں اور چالیس ہزار کینڈی ایگس کو چھپا دیا گیا اس مقابلے میں اسی شخص کو فاتح قرار دیا گیا جس نے کم سے کم مدت میں سب سے زیادہ انڈے تلاش کر کے جمع کئے تھے۔ انڈوں کی بات چلی ہے تو اسی حوالے سے ایک مقابلہ ابلے ہوئے انڈے چھیلنے کا بھی ہوتا ہے۔ مسٹر ہیرلڈ ویکٹلیب اور مسٹر گورلڈ ہارڈنگ نامی دو باورچیوں نے ایسے ہی ایک مقابلے میں حصہ لیا اور ۷ گھنٹوں کی مدت تک میں

۱۰۵۰ درجن انڈے چھیلنے کا مظاہرہ کر کے انعام حاصل کیا۔ اس مقابلے کی دلچسپ اور حیران کن بات یہ تھی کہ دونوں باورچی نابینا تھے۔

انڈے کھانے کا بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ سخت ابلے ہوئے انڈے کھانے میں پیٹر ڈوڈ سبویل نے ۵۸ سیکنڈ کی مختصر سی مدت میں ۱۴ انڈے کھالینے کا مظاہرہ کر کے انعام و شہرت حاصل کی جب کہ انہوں نے کم ابلے ہوئے ۳۴ انڈوں کو صرف ۷۵ سیکنڈ میں منہ کے ذریعہ معدے میں اتارنے کا مظاہرہ کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

کھڑکی صاف کرنے کا ایک مقابلہ ہوا اس مقابلے میں شرکت کرنے والوں کو ۴۵ × ۴۰ انچ سائز کی تین کھڑکیوں کو ۱۱ء۸ انچ لمبی ربر جھاڑو اور ۱۵ء۸۳ پائنٹ پانی کی مدد سے صاف کرنا تھا۔ یہ مقابلہ سڈنی کے راس رڈے نے صرف ۱۹ سیکنڈ میں کھڑکی چمکا کر جیت لیا تھا۔ اور ہاں یاد آیا، جوتے چمکانے کے بھی تو مقابلے ہوتے ہیں۔ اس مقابلے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ۸ گھنٹوں کے درمیان کون سب سے زیادہ اور سب سے اچھے جوتے چمکاتا ہے۔ اس مقابلے میں اب تک ۷۸۰ جوڑے جوتوں کو چمکانے کا ریکارڈ ہے۔ جوتوں کے علاوہ چہروں کے چمکانے کا بھی مقابلہ ہوتا ہے۔ داڑھی بڑھانے مونچھیں بڑھانے کے بھی مقابلے ہوتے ہیں۔ دنیا میں سب سے تیز شیو بنانے کا عالمی اعزاز گیری ہارلر کو حاصل ہے۔ جس نے ایک گھنٹے میں ۹۸۷ اشخاص کا شیو بنا کر یہ اعزاز حاصل کیا۔

کسی ایک جگہ پر بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ اور بوریت سی ہونے لگتی ہے۔ مگر دنیا میں ایک مقابلہ ایسا بھی ہوتا ہے جس میں شرکائے مقابلہ کو بغیر کسی سہارے کے ایک کھمبے پر سب سے زیادہ وقت تک بیٹھنے کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسے ہی مقابلے میں ۴۸۸ دن تک بیٹھے رہنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا گیا جب کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۳۹۰ء میں ایک سٹھ واسی شخص نے اپنی زندگی کے آخری ۳۷ سال پتھر کے ایک کھمبے پر بیٹھے بیٹھے گزارے تھے۔

سر پر دودھ کی بوتل رکھ کر دوڑنے کا مقابلہ جمیکا کے شہری نے جیتا یہ صاحب بوتل کو سر پر رکھ کر اس طرح ۲۴ میل تک دوڑتے چلے گئے کہ وہ کہیں بھی نہیں گری۔

انوکھے اور حیرت ناک مقابلوں کے اسی تذکرہ میں ایک اور دلچسپ مقابلہ کافی بلندی سے انگور کے دانوں کو زمین پر گرنے سے پہلے شرکا اپنے کھلے ہوئے منہ میں کیچ کر کے کھا جانے کا مظاہرہ کرتے ہیں ایسے ہی ایک مقابلے میں ٹوکیو کی ۶۶۰ فٹ بلند عمارت سے نیچے ٹپکائے گئے انگور کے دانوں کو منہ سے کیچ کر کے کھانے کا کامیاب ترین مظاہرہ پال نیو یلیا نے کرکے کامیابی حاصل کی۔ اسی قسم کا ایک اور مقابلہ ہوتا ہے۔ اس میں مقابلے میں شریک شخص نے قد کی بلندی کے برابر خاصے فاصلے سے کھڑے ہو کر انگور کے دانے کھلے ہوئے منہ میں ڈالنے ہوتے ہیں ایسے مقابلوں میں اب تک ۳۱۹ فٹ کے

فاصلے سے پھینکے گئے دانوں کو دوسرے کونے پر کھڑے شخص مسٹر چیمپئن نے اپنے منہ میں کیچ کرنے کا مظاہرہ کر کے انعام حاصل کیا۔

اسکولوں میں اکثر اساتذہ طلبہ کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہونے جانے کی سزا سناتے ہیں اسکولوں میں دی جانے والی اس سزا کو بھی مقابلوں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بھارت کے ایک شہری این ردی نے ۳۷ گھنٹوں تک ایک ٹانگ پر مسلسل کھڑے ہونے کا مظاہرہ کر کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

ساتھیو ..... دیکھا آپ نے اس دنیا میں کیسے کیسے حیرت انگیز مظاہرے اور مقابلے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو ان مقابلوں اور مقابلوں میں شرکت کرنے والے لوگوں پر ہنسی آئے مگر ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ مسلسل مشق، ان تھک محنت، ذہانت اور بے پناہ لگن کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حیرت انگیز مقابلے ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد مشق، محنت اور لگن کا پیغام دیتے ہیں۔

باتیں بنگال کی

جب آپ بازار میں جا رہے ہوں اور "بادام بادام" کی آواز کانوں میں پڑے تو ہرگز نہ رکیں، یہ مونگ پھلیاں بیچی جا رہی ہیں۔ اگر آپ کا دھوبی کبھی نظریں نیچی کئے آپ کو یہ بتائے کہ "پنجابی" پھٹ گئی ہے تو پریشان نہ ہوں، کیونکہ ململ کی قمیص کو یہاں پنجابی کہتے ہیں۔ اگر آپ کا باورچی صبح ناشتے میں یہ کہے کہ میں آج آپ کو "ڈھیم" کھلاتا ہوں تو غصے سے لال پیلے نہ ہوں کیونکہ یہاں پر ڈھیم انڈے کو کہتے ہیں جب کہ پنجابی میں یہی لفظ پتھر یا روڑے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

اگر آپ کے سر کے بال بڑھ چکے ہیں اور آپ انہیں کٹوانے کے موڈ میں ہوں تو حجام کے حمام پر قدم رکھتے ہی پہلے اپنی زبان مبارک پر قابو کر لیجئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اسے بال بنانے کو کہیں اور وہ استرا لے کر آپ پر چڑھ دوڑے۔ کیونکہ "بال" یہاں ایک گالی ہے۔ اگر آپ سر کے بال کٹوانا چاہتے ہیں تو لفظ "چول" استعمال کریں ..... تب کہیں آپ کی چولیں ٹھیک ہونگی۔

محمد اکرم سیالوی ..... ننکانہ صاحب

جیک مرفی ترجمہ۔ امتیاز جلیل

موت انہیں چھو کر گزر گئی

پیر یکم مئی ۱۹۸۹ء کی صبح بہت خوشگوار تھی۔ کیٹ پرچرڈ، جس کی عمر تیس سال تھی، سودے سلف کے تھیلے سمیٹ رہی تھی کہ اسے دور کہیں ریل کے انجن کا ہارن سنائی دیا۔ ٹرینیں کیٹ کے گھر سے تقریباً تین سو فٹ کے فاصلے سے گزرتی تھیں۔ کیٹ کے گھر کے پچھلے حصے اور ریل کی پٹڑی کے درمیان کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی سوائے ان گھنے درختوں کے جو وہاں موجود تھے۔

کیٹ کے دونوں بیٹے، ساڑھے تین سالہ ٹوڈ اور اٹھارہ ماہ کا اسکاٹ، گھر کے پچھلے حصے میں کھیلنے میں مصروف تھے۔ ٹرین کا ہارن سن کر وہ درختوں کے درمیان سے گزر کر ریل کی پٹڑی کے قریب چلے گئے اور پٹڑی پر بیٹھ کر کھیلنے لگے۔

ٹھیک اسی وقت مغرب کی سمت سے ایک ٹرین بچوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سگنل کی ہری بتیاں دیکھ کر ٹرین کے ڈرائیور رچ کمپانا نے ٹرین کی رفتار تیز کر دی۔ کیوں کہ ہری بتیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ آگے راستہ صاف ہے۔ ڈرائیور مطمئن ہو گیا اور اپنے ساتھی کی طرف مڑا جو کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔

"انتھونی تم اس ویک اینڈ پر کیا کرو گے؟" رچ نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ انتھونی طویل مدت

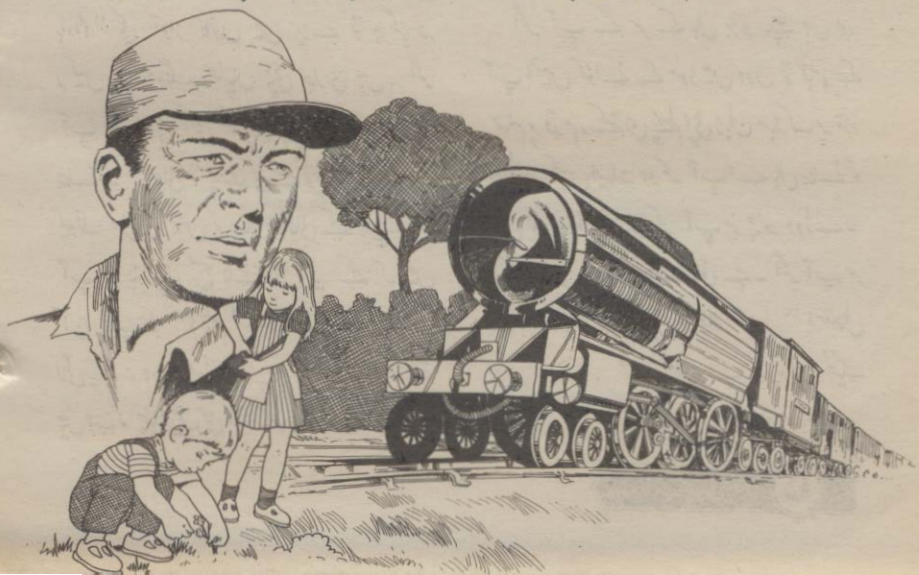

سے ٹرین کے انجن میں ملازم تھا۔ اس نے اور رچ نے اس علاقے سے جہاں سے اس وقت ٹرین گزر رہی تھی، کئی دفعہ سفر کیا تھا۔ اور اس دوران اپنے گھر کے پچھلے حصے میں کھیلتے ہوئے ٹوڈ اور اسکاٹ نے کئی دفعہ ٹرین کو دیکھ کر ہاتھ ہلائے تھے اور انتھونی بھی ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلانا کبھی نہیں بھولا تھا۔

انتھونی جو اب تک سنجیدگی سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، رچ کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"اوہ۔ کوئی خاص کام نہیں۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھوں گا اور پھر سو جاؤں گا۔"

ابھی دونوں کی بات چیت جاری تھی اور ٹرین اکیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتی جارہی تھی کہ اسی لمحے رچ اور انتھونی کو سامنے کی سمت کوئی چیز نظر آئی۔

"وہ سامنے کیا چیز ہے؟۔" رچ نے پوچھا انتھونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے پٹڑی پر موجود چیز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی گتے کا ڈبہ..... یا کپڑے کا کوئی ٹکڑا..... اس کے ذہن میں مختلف چیزیں آرہی تھیں۔

اچانک دونوں کو احساس ہوا کہ سامنے کیا چیز ہے۔ رچ نے فوراً ایمرجنسی بریک لگائے۔ اور پوری قوت سے ہارن بجانے لگا۔ پٹڑی پر ٹوڈ اور اسکاٹ موجود تھے۔ انتھونی کے ساتھ بہت سے عجیب و غریب حالات پیش آچکے تھے خاص طور پر جب وہ پولیس میں ملازم تھا۔ اس کا وہ تجربہ اس وقت کام آیا۔ اس نے فوراً خود کو کھڑکی سے باہر نکالا اور ایک تختے پر پیر رکھے جو پہیوں سے چھ فٹ بلند تھا۔ وہاں سے وہ مزید نیچے اترا یہاں تک کہ وہ زمین سے صرف دو فٹ اوپر رہ گیا۔ اب وہ دو چھوٹے بچوں کو بآسانی دیکھ سکتا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ ہٹ جاؤ..... ہٹ جاؤ..... اس نے ذہن میں ٹرین کی کم ہوتی ہوئی رفتار کا اندازہ لگایا اور سوچا کہ ہم وقت پر نہیں رک سکتے۔

ادھر اپنے کھیل میں مگن ٹوڈ اور اسکاٹ ٹرین کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ آخر جب آواز بالکل قریب پہنچ گئی تو اسکاٹ نے سر اٹھایا اور ٹرین کو اتنا نزدیک دیکھ کر ساکت رہ گیا۔

باوجود اس کے کہ ٹرین آہستہ ہوتی جارہی تھی انتھونی جانتا تھا کہ ٹرین بچوں تک پہنچنے سے پہلے نہیں رک سکے گی۔ اس نے ٹرین کے بچوں کے اور زیادہ نزدیک پہنچنے کا انتظار کیا یہاں تک کہ بچوں اور ٹرین کے درمیان صرف دس فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

انتھونی نے نہایت بہادری سے کام لیتے ہوئے چلتی ٹرین سے آگے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ نیچے پڑے ہوئے پتھروں پر اس نے اپنا توازن بمشکل برقرار رکھا اور پھر وہ چھلانگ لگا کر بچوں تک پہنچ گیا۔

اس نے ایک بچے کو پٹڑی پر سے ہٹا دیا مگر اسی اثنا میں ٹرین سر پر پہنچ گئی۔ انتھونی نے دیکھا کہ انجن

کے آگے لگے ہوئے اسٹیل کا کونا بچے کے سر پر لگا اور خون نکل آیا۔ اس نے اسکاٹ کو اپنے نیچے کر لیا اور خود اپنا سر پتھروں میں چھپا لیا۔ ٹرین اس سے چند انچ اوپر سے نکل گئی۔

ادھر ٹرین کے مسلسل بجتے ہوئے ہارن کی آواز بچوں کی ماں کیٹ نے بھی سن لی۔ وہ باہر کی طرف بھاگی۔ ٹوڈ اور اسکاٹ گھر کے پچھلے حصے میں موجود نہیں تھے۔ وہ ریلوے لائن کی طرف دوڑی وہاں سب سے پہلے اسے ٹوڈ دکھائی دیا۔ وہ بُری طرح رو رہا تھا۔ مگر کیٹ نے دیکھا وہ زخمی نہیں تھا۔ اس نے ٹوڈ کو تھام لیا۔ پھر اسے ایک آدمی نظر آیا اس آدمی کے نیچے اسے اسکاٹ کا خون میں بھرا ہوا سر دکھائی دیا۔

"اسکاٹ!" وہ چلّائی۔

اس کی آواز سن کر انتھونی چیخا "خاتون! فوراً پولیس اور ایمبولینس کو فون کریں۔" کیٹ نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور بازو پھیلا کر اسکاٹ کی طرف بڑھی۔

انتھونی اب کے غصے سے چیخ کر بولا۔

"اپنے گھر جاؤ اور پولیس اور ایمبولینس کو بلاؤ۔ جاؤ جلدی کرو۔" کیٹ اپنے گھر کی طرف بھاگی۔

جب پولیس کی پہلی گاڑی وہاں پہنچی اس وقت بھی انتھونی نے اسکاٹ کو سنبھال رکھا تھا۔

اسکاٹ کو معجزانہ طور پر خطرناک چوٹیں نہیں آئی تھیں اور اسے صرف تیرہ ٹانکے لگے۔

اخباری رپورٹروں نے بعد میں انتھونی سے دریافت کیا کہ کیا وہ اپنی جان خطرے میں ڈالنے سے قبل ہچکچایا نہیں۔

"نہیں....." اس نے جواب دیا۔

"میرے ذہن میں صرف یہ بات تھی کہ ان بچوں کے سامنے ان کی پوری زندگی ہے۔ اگر میں نے ان کی مدد نہ کی تو وہ ہلاک ہو جائیں گے اور..... میں ایسا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

اس حادثے کے بعد جب انتھونی دوبارہ کیٹ کے گھر گیا تو اس نے اسکاٹ اور ٹوڈ کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔

"ان کو اٹھاتے ہی مجھے وہ لمحہ یاد آ گیا ہے جب میں نے ان کو ریل سے بچایا تھا اور میرے محسوسات اس وقت بڑے عجیب ہیں۔"

انتھونی اب اس گھر کا ایک فرد بن چکا ہے اور ہاں ایک بات یہ کہ اب ایک باڑھ ان بچوں کے گھر اور ریل کی پٹڑی کے درمیان کھڑی ہو گئی ہے۔

طالبانِ
علم و ادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ہی فائدہ اُٹھائیے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ﷺ۔ سیرت طیبہ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نما قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفر مبارک حجازِ مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو تعمیر سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا:۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱٦۔

مہارشی بالمیکی

گنگا کے کنارے مہارشی چیون کا آشرم خوش نما جنگل سے گھرا ہوا تھا۔ ایک دن جب رشی کام سے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کی بیوی اپنے چھوٹے سے بچے کو گود میں لئے ان کا انتظار کر رہی تھی، جنگل سے گھوڑوں پر کچھ ڈاکو آئے اور بچے کو چھین کر غائب ہوگئے۔ رشی کی بیوی روتی چلاتی رہ گئی۔

جب رشی واپس آئے تو ان کو بچے کے اغوا کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ رشی نے کہا "ہو نہ ہو یہ اسی ڈاکو کا کام ہے جس کے بیٹے کو انہوں نے یہ کہہ کر نکال دیا تھا کہ ڈاکو کا بیٹا بھی یقیناً ڈاکو ہی بنے گا۔ اس پر ڈاکو نے دھمکی دی تھی کہ کیا رشی کا بیٹا کبھی ڈاکو نہیں بن سکتا۔

بچہ جب ڈاکوؤں کے کروہ میں پل پوس کر بڑا ہوا تو انہوں نے اسے بھی لوٹ مار اور قتل و غارت کے کام میں لگا دیا۔ لڑکا اکثر سوچتا کہ آخر یہ لوگ ڈاکا کیوں ڈالتے ہیں، لوٹ مار کیوں کرتے ہیں، قتل کیوں کرتے ہیں۔ اسے یہ سب دیکھ کہ بہت دکھ ہوتا۔ ایک دن اسے پہلے سے پتہ چل گیا کہ فلاں گاؤں پر دھاوا بولا جائے گا۔ اس نے چپکے سے چھپ کر گاؤں میں پہلے سے اطلاع کرادی۔ اگلے روز جب ڈاکا

پڑا تو گاؤں والوں نے مل کر پوری تیاری سے مقابلہ کیا اور سب ڈاکوؤں کو مار ڈالا۔

اس لڑکے یعنی رتناکر کو انعام دیا گیا اور اس سے اس کی اصلیت پوچھی گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک رشی کا بیٹا ہے جسے بچپن ہی میں ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے۔ گاؤں والوں نے خوش ہو کر رتناکر کو زمین دی۔ اس کی شادی بھی وہیں گاؤں میں کر دی اور وہ خوشی خوشی زندگی بسر کرنے لگا۔

چند برسوں کے بعد بڑا سخت قحط پڑا۔ لوگ دانے دانے کو ترس گئے۔ سارا گاؤں خالی ہو گیا۔ رتناکر بھی اپنی بیوی بچوں کو لئے گاؤں سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک دن سفر کی تکان دور کرنے کے لئے وہ تمسا ندی کے کنارے بیٹھا ہوا تھا کہ بیل گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوئی ہے۔ رتناکر کے پیٹ میں بھوک طوفان بن کر جاگ اٹھی اور اس نے جھٹ سے گاڑی پر دھاوا بول دیا۔ گاڑی بان اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا۔ گاڑی کا سارا سامان رتناکر کے ہاتھ لگا۔ اس نے خوشی خوشی بیوی بچوں سے کہا "لو اب کئی دنوں کے لئے فراغت ہو گئی۔"

اس دوران میں وہ بار بار سوچتا رہا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ بھوکا مرنے والا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ لیکن یہ بھی تو ڈکیتی ہے۔ تو ہوا کرے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ گاؤں چھوٹ گیا، زمین چھوٹ گئی، روزی کا کوئی سہارا نہیں رہا۔ اب تو جو بھی کرنا پڑے، کروں گا۔ آخر بیوی بچوں کو بھی تو پالنا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر رتناکر ڈاکو بن گیا، اور لوٹ مار کر کے اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے لگا۔

ایک دن رتناکر نے کچھ رشیوں پر حملہ کیا اور کہا "جو کچھ بھی تمہارے پاس ہو، رکھ دو۔"

"نارائن، نارائن۔ ہم سادھو لوگ ہیں، ہمارے پاس کیا رکھا ہے۔" نارد مُنی نے کہا۔

رتناکر نے بگڑتے ہوئے کہا "باتیں مت بناؤ، جلدی کرو، میں ڈاکو ہوں۔"

"مگر تم یہ پاپ کیوں کرتے ہو؟"

"بیوی بچوں کے لئے۔"

"لیکن اپنے پاپ کی سزا تو تمہیں اکیلے ہی بھگتنی پڑے گی۔ تمہارے بیوی بچوں کو نہیں۔"

"کیوں نہیں۔ جب وہ میری کمائی کے حصے دار ہیں تو میری برائی بھلائی میں بھی برابر کے حصے دار ہوں گے۔"

نارد مُنی نے نرم لہجے میں کہا "ہرگز نہیں، یقین نہ آئے تو جا کر ان سے پوچھ لو۔"

رتناکر نے رشیوں کو درخت سے باندھ دیا اور گھر جا کر بیوی بچوں سے پوچھا،

"میں تمہیں پالنے کے لئے لوٹ مار کرتا ہوں۔ کیا تم عذاب ثواب میں میرے برابر کے حصے دار

نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں، تم گھر کے مالک ہو۔ ہماری پرورش تم پر فرض ہے۔ ہم نے تمہیں پاپ کرنے کو کبھی نہیں کہا۔"

بیوی کا جواب سن کر رتناکر کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ بھاگا ہوا رشیوں کے پاس آیا، ان کی رسیاں کھولیں اور ان کے قدموں میں گر گیا۔ نارد جی نے کہا "پرائشچت (نجات) کا ایک ہی راستہ ہے۔ تمہیں تپسیا (ریاضت) کرنی پڑے گی۔"

رتناکر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جنگل میں سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ مدتیں گزر گئیں۔ یہاں تک کہ اس کے جسم پر مٹی کا ٹیلا سا بن گیا۔ کئی برسوں کے بعد اچانک ایک دن نارد جی کا گزر پھر ادھر سے ہوا۔ وہ رتناکر رتناکر کہہ کر پکارتے رہے، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ رتناکر کی تو کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ انہوں نے کہا "رتناکر یاد ہے، تم ایک ڈاکو تھے۔ حالات نے تمہیں ڈاکو بنا دیا تھا، لیکن اب تمہارے خاندانی اعمال اور خصائل تمہیں پھر اعلا کردار کی طرف لے آئے ہیں۔ تم نے جتنی تپسیا کی ہے اس سے تو یہ لگتا ہے کہ تم رتناکر نہیں بالمیک ہو جس میں جانوروں نے "بلمیک" یعنی "بل" بنا رکھے ہیں۔ تمہاری تپسیا کی بنا پر میں تمہیں آج سے بالمیک کا نام دیتا ہوں۔"

بالمیک نے تمسا ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی کٹیا بنالی اور پھل پھول کھا کر گزر کرنے لگا۔ ایک دن وہ ندی کے کنارے بیٹھا تھا کہ کرونچ پرندوں کا جوڑا سامنے پیڑ پر کلول کر رہا تھا۔ اچانک کسی شکاری نے تیر مارا اور دونوں پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر آگرے۔ بالمیک سے ان کی حالت دیکھی نہ گئی۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور ان کی زبان سے کچھ بول نکل گئے۔ نارد جی بھی وہاں آپہنچے۔ بالمیک نے وہی بول نارد جی کو سنائے۔ انہوں نے کہا "جو کچھ تم نے کہا ہے، اور جس طرح کہا ہے، اس کو شلوک (شعر) کہتے ہیں۔ تم دنیا کے سب سے پہلے شاعر ہو۔ علم اور فن کی دیوی سرسوتی تم پر مہربان ہے۔ لہٰذا اسی چھند (بحر) میں تم رام چندر جی کے حالات رامائن کے نام سے لکھنا شروع کر دو۔"

اس کے بعد بالمیک رامائن لکھنے کے کام میں لگ گیا۔ اس کا دل درد سے چور تھا۔ ایک ایک لفظ جو اس نے لکھا وہ اس قدر عقیدت اور محبت میں ڈوبا ہوا ہے کہ آج تک لوگ پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ اس کارنامے سے بالمیک کا نام زندۂ جاوید ہو گیا۔ بالمیک نے رامائن کو سنسکرت میں لکھا تھا، تلسی داس نے اسے "رام چرت مانس" کے نام سے (اودھی) ہندی میں لکھا اور رام چندر جی کے اعلا انسانی اوصاف کے لازوال پیغام کو گھر گھر پہنچا دیا۔

دریچہ

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

سوال ..... کیا ہیلے کا دم دار ستارہ تباہ ہو گیا ..... ؟ کب ..... ؟

راحیل بن یحییٰ ..... حیدر آباد

جواب ..... نہیں بھئی ..... ! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہیلے کا دم دار ستارہ بدستور قائم و دائم ہے۔ اور اپنے مدار میں رہتے ہوئے سورج کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ آپ کی معلومات کے لئے ہم یہ بتاتے چلیں کہ دم دار ستارے، ستارے نہیں بلکہ سیارے ہیں۔ اور نہایت چپٹے بیضوی مدار میں سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ دم دار ستارہ دراصل منجمد گیسوں پر مشتمل ایک گولے کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے اجزا میں میتھین، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ٹھوس امونیا وغیرہ شامل ہیں۔ جب کوئی دم دار ستارہ سورج کے قریب آجاتا ہے تو اس کی گیسیں پھیل کر ہماری زمین کے برابر یا اس سے بھی بڑے گولے کی شکل میں اختیار کر لیتی ہیں۔ مزید قریب پہنچنے پر اس پر سورج سے نکلنے والے جوہری دباؤ کا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے سیارے کے ایک جانب گیسیں پھیل کر ایک دُم کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ دُم بعض اوقات لاکھوں میل لمبی ہوتی ہے۔ سورج سے نکلنے والی مخصوص شعاؤں کی وجہ سے یہ منوّر ہو جاتا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ دم دار ستارے کی دُم سورج سے نکلنے والی

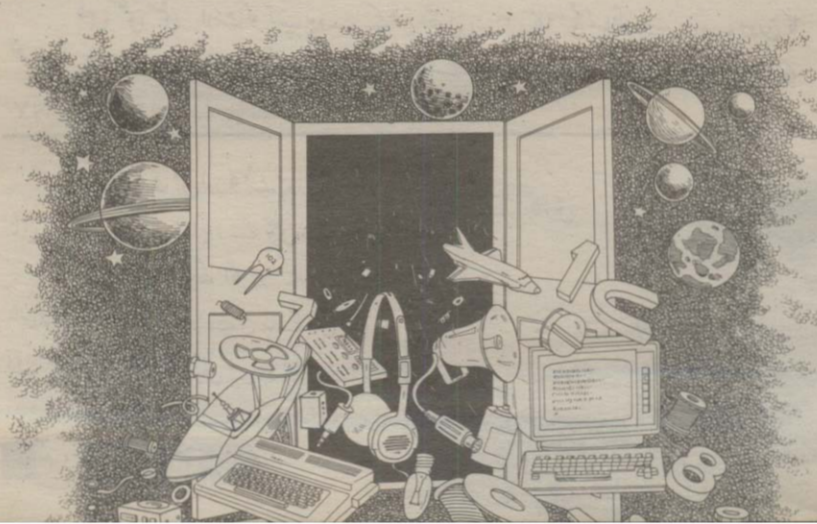

تابکاری کی تاب نہیں لاسکتی اس لئے ہمیشہ سورج کے مخالف سمت میں ہوتی ہے۔

ہیلے کا دم دار ستارہ برطانوی ماہر فلکیات ایڈمنڈ ہیلے کے نام سے پہچانا جاتا ہے جنہوں نے اسے پہلی بار ۱۶۸۲ء میں دریافت کیا۔ ہیلے کا دم دار ستارہ ہر ۷۶ سال کے بعد زمین سے دیکھا جاسکتا ہے۔ آخری بار یہ ۱۹۸۶ء میں نمودار ہوا تھا۔ اس کے بغور مطالعے کے لئے جون ۱۹۸۵ء میں ایک خلائی جہاز کو خلا میں بھیجا گیا۔ جس نے ۵۰۰ ملین میل کا فاصلہ طے کر کے ہیلے کے دم دار ستارے سے صرف ۳۷۶ میل کی دوری پر ملاقات کی اور خود پر نصب شدہ کیمروں اور کمپیوٹروں کی مدد سے سائنس دانوں کو نہایت قیمتی معلومات فراہم کیں۔

گھر کے ایسے حصوں میں جہاں سورج کی روشنی پہنچنا مشکل ہو وہاں بھی پودے اگائے جاسکتے ہیں۔

اس ننھی مُنّی لائٹ کو آپ پودے کے اوپر لگادیں۔ اس کا ۶ انچ لمبا فلورینسنٹ بلب سورج کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے۔ اس کی قیمت ۳۴ ڈالر ہے۔ اسے 636S.COLOMBUSAVE,Mt VERNON.NY نے بنایا ہے۔

خود کار گاڑی

۱۳٫۵ فٹ لمبی اور ۹ فٹ چوڑی ALV نامی یہ گاڑی بغیر کسی ڈرائیور کے چلتی ہے۔

گاڑی کے آگے لگا ہوا کیمرہ اور لیزر شعاعوں کی آنکھوں کی مدد سے لی جانے والی تصاویر ایک کمپیوٹر میں منتقل کی جاتی ہیں جو گاڑی کو آگے بڑھنے، روکنے اور موڑنے کا کام انجام دیتا ہے۔

سمندر کا پانی نمکین کیوں ہوتا ہے؟

آئے دن ہمیں زمین کے بارے میں ایسے حقائق کا علم ہوتا رہتا ہے جو ہماری حیرت میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ انہی حقائق میں سے ایک سمندر میں نمک کی موجودگی ہے۔ نمک سمندر میں کیسے گیا؟ اس کا ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ نمک پانی میں حل پذیر ہوتا ہے چنانچہ بارش کے پانی کے ساتھ وہ سمندر میں حل ہو جاتا ہے زمین کی سطح پر موجود نمک مستقل ..... طور سے حل ہو کر سمندر میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عمل سمندر میں موجود نمک کی بھاری تعداد کا موجب ہے۔ اگر تمام سمندروں کے پانی کو خشک کر لیا جائے تو اتنا زیادہ نمک بنے گا جس سے ۱۸۰ میل اونچی ..... اور ایک میل چوڑی نمک کی دیوار بنائی جا سکتی ہے جس کی جسامت براعظم یورپ سے پندرہ گنا زیادہ ہوگی۔ عام نمک جو ہم سب استعمال کرتے ہیں سمندر کے پانی سے حاصل کیا جاتا ہے سمندر کے پانی میں نمک کا ارتکاز پونے تین فیصد تک ہوتا ہے۔ کھلے سمندروں میں زیادہ نمک موجود ہوتا ہے۔

بحیرہ مردار (جو ۳۴۰ مربع میل کے خطے پر واقع ہے) میں ۱۰۵۲۳۰۰۰۰۰۰ ٹن نمک کی تعداد موجود ہے۔ اوسطاً سمندر کے ایک لیٹر پانی میں ۳۰ گرام نمک کے جو ذخائر چٹانوں کی شکل میں موجود ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لاکھوں سال پہلے سمندر کے پانی کی تبخیر سے وجود میں آئے۔ نمک کی چٹان بننے کے لئے بہ لحاظ حجم ۹/۱۰ حصے سمندر کے پانی کی تبخیر ضروری ہے۔ زیادہ تر تجارتی نمک، نمک کی چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نمک کے ذخائر تک کنوئیں کھودے جاتے ہیں جس میں پائپ کے ذریعے خالص پانی پہنچایا جاتا ہے۔ یہ پانی نمک کو حل کر لیتا ہے اور پھر اس کو ایک اور پائپ کی مدد سے اوپر کھینچ لیا جاتا ہے۔ !!

سمندر کی گہرائی:۔ سمندر اب بھی ہمارے لئے بہت پراسرار ہے یعنی ہم اس کے راز اب بھی نہیں جانتے کہ سمندر کتنا پرانا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ جب ہماری زمین اپنے وجود کے ابتدائی دور میں تھی تو سمندر کا نام و نشان بھی تھا۔

آج انسان سمندر کے اندر سے راز نکالنے کے لئے اس کی گہرائیوں میں جاکر تحقیقات کر رہا ہے۔ ۳ ہزار ۶ سو ۶۰ میٹر کی گہرائی تک سمندر کی اندرونی سطح میں کیچڑ ہی کیچڑ ہے یہ سطح سمندر کی مخلوق کے چھوٹے چھوٹے ڈھانچوں سے بنی ہے جو گل سڑ کر چونے جیسی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ سمندر کے زیادہ گہرے اور اندھیرے حصوں میں جہاں پانی چار میل تک گہرا ہے۔ سطح سمندر زنگ کے رنگ والے کیچڑ پر مشتمل ہے اسے لال مٹی بھی کہا جاتا ہے یہ سطح سمندر مخلوق کے ڈھانچوں کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں، سمندری پودوں کے ٹکڑوں اور آتش فشاں راکھ سے بنی ہے۔

آج کل سمندر کی گہرائی ناپنے کے لئے آواز کی لہروں کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

سمندر کی اوپری سطح سے آواز کی لہریں نیچے بھیجی جاتی ہیں یہ لہریں سمندر کی گہری سطح سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں آواز کی لہروں کی روانگی اور واپسی کا وقت آدھے آدھے میں تقسیم کیا جائے تو سمندر کی گہرائی معلوم ہو جائے گی۔ آواز کے سفر کی رفتار تو معلوم ہی ہے اب صرف یہ حساب لگانا ہوتا ہے کہ آواز کتنی دیر میں سمندر کی تہہ تک گئی اور کتنی دیر میں واپس آئی۔

اس طریقے پر عمل کر کے اب ہم نے مختلف سمندر کی گہرائیوں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات جمع کر لی ہیں اور ہر سمندر کے اندر سب سے گہرے مقام کی نشاندہی بھی کر لی ہے۔ سب سے زیادہ گہرائی والا سمندر بحرالکاہل ہے اس کی اوسط گہرائی ۴ ہزار ۲ سو ۲۸ میٹر ہے اس کے بعد سب سے زیادہ اوسط گہرائی والا سمندر بحر ہند ہے جس کی اوسط گہرائی ۳ ہزار ۹ سو ۶۳ میٹر ہے اوسط گہرائی میں بحراوقیانوس تیسرے نمبر پر ہے اس کی اوسط گہرائی ۳ ہزار ۹ سو ۲۶ میٹر ہے۔ بحیرہ بالٹک سب سے کم گہرا ہے اس کی اوسط گہرائی صرف ۵۵ میٹر ہے۔

شیشہ کیسے بنتا ہے؟

شیشہ کو عام استعمال کی چیز ہے مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شیشہ بنتا کیسے ہے؟

شیشے کے لئے تین چیزیں چاہئیں۔ ریت (خاص شیشہ بنانے والی جسے سلیکا کہتے ہیں) سوڈا اور چونا۔ ان سب کو آگ کی بھٹی میں پگھلایا جاتا ہے۔ اس پگھلے ہوئے آمیزے کو ہم شیشے کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں ڈھال سکتے ہیں۔ یہ بڑے ٹکڑے کھڑکی دروازوں اور تصویروں کے فریم اور آئینہ سازی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ضرورت کے مطابق شیشے کو شربت یا جام اور جیلی کی بوتلوں کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے یا پھر بڑے ماہر کاریگر ایک لمبی سی نالی کے ذریعے پگھلے ہوئے شیشے کو غبارے کی طرح پھلا کر کسی بھی شکل میں ڈھال لیتے ہیں۔ آج کل مختلف اجزا کے استعمال سے کئی قسم کا شیشہ بنایا جاتا ہے پگھلے ہوئے شیشے کو مختلف درجے پر ٹھنڈا کرنے سے بھی شیشے کی خصوصیات تبدیل ہو جاتی ہیں۔

سب سے پہلے شیشہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یعنی آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں بنایا گیا تھا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مصر میں شیشہ استعمال ہوتا تھا شیشہ بنانے کا فن مصر سے چین آیا پھر یہاں سے یورپ پہنچا۔

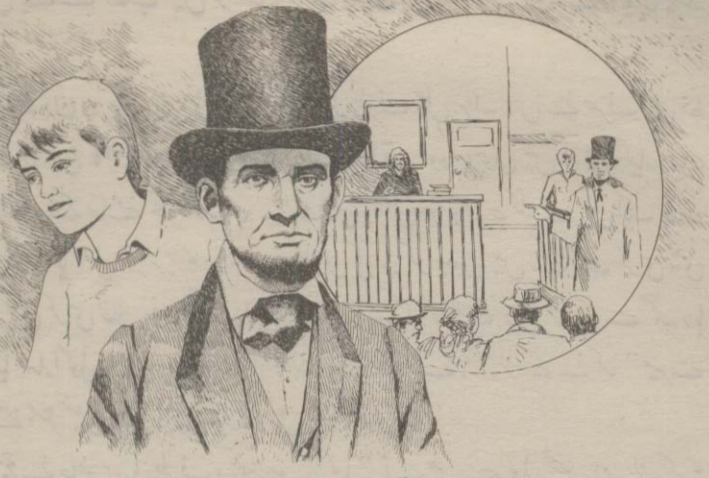

بے گناہ مجرم

جبران ملک

وہ شخص جوں جوں اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط پڑھ رہا تھا، اس کے ماتھے پر پریشانی کی شکنیں نمایاں ہوتی گئیں، اور پھر خط کے آخر میں خط لکھنے والے کا نام دیکھ کر اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اسی اثناء میں اس کا سیکریٹری کمرے میں داخل ہوا اور بولا "سر! میں آپ کو یاد دہانی کرانے آیا تھا کہ کل یعنی جمعہ کو آپ نے اپنے کیریئر کے سب سے اہم اجلاس سے خطاب کرنا ہے۔" وہ شخص مسکرا کر بولا، "لیکن کل میں

اس جلسے سے خطاب نہیں کر سکتا۔" "لیکن آپ کے اس الیکشن میں جیتنے اور اپنا سیاسی کیرئر سنوارنے کا دار و مدار اس خطاب پر ہے۔" سیکریٹری نے حیرانگی سے کہا۔ "میں پھر بھی اس جلسے سے خطاب نہیں کر سکتا۔ آپ جاسکتے ہیں۔" اس شخص نے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اگلے دن وہ پیدل ہی اپنی منزل مقصود کی طرف چل پڑا۔ اس نے صرف اس خط کی وجہ سے اپنا آج کا اہم اجلاس چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ سوچوں میں گم چلتا گیا۔ اب وہ ایک عدالت کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ عدالت میں داخل ہوا تو اسے کٹہرے میں ایک پندرہ سالہ لڑکا نظر آیا جس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وکیلوں کی دو کرسیوں میں سے ایک کرسی یعنی وکیل دفاع کی کرسی خالی پڑی تھی۔ اس شخص نے سنا کہ عدالت کا جج لڑکے سے کہہ رہا تھا۔ "کیا تمہارا کوئی وکیل ہے یا وکیل کا بندوست کیا جائے؟" لڑکے نے کہا "میرے حالات اتنے بہتر نہیں ہیں کہ میں ایک وکیل رکھ سکوں۔"

جج نے حاضرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ میں سے کوئی شخص اس لڑکے کا وکیل بننا پسند کرے گا؟" وہ شخص آگے بڑھ کر بولا، "جی ہاں! میں ان کا وکیل بننا پسند کروں گا۔" پھر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ "میرا نام ابراہیم لنکن ہے۔" تمام لوگ بڑی حیرت سے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ وہ اسے ایک سیاستدان کی حیثیت سے جانتے تھے۔

آخر کار جج نے اسے مقدمہ لڑنے کی اجازت دے دی۔ اس کو مقدمے کی تفصیل بتائی گئی جو کچھ اس طرح تھی۔

"اس لڑکے کا نام جان ہے۔ جان ایک شخص (سائمن) کے فارم پر کام کرتا تھا۔ سائمن اس سے سختی سے پیش آتا تھا۔ اور اسے کام کا معاوضہ بھی کم دیتا تھا اور بات بات پر اسے ڈانٹتا اور مارتا پیٹتا بھی تھا۔ ایک دن جان ٹرک پر گائے بھینسوں کے لئے چارہ لایا اس نے سائمن سے کہا کہ وہ دروازہ کھولے۔ لیکن سائمن نے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اسے ایک تھپڑ مارتے ہوئے گالی بھی دی تو جان نے ایک بیلچہ اٹھا کر پوری قوت سے سائمن کے سر پر دے مارا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔"

جب ابراہیم لنکن یہ سب واقعات سن چکا تو جج کے کہنے پر مقدمے کی کارروائی شروع کی گئی۔

وکیل استغاثہ نے لڑکے سے چند سوال پوچھے اور اسے مجرم ٹھہرایا لیکن ابراہیم لنکن نے نہ تو کوئی اعتراض اٹھایا اور نہ اس لڑکے سے کوئی سوال پوچھا۔ جیوری اور تمام حاضرین حیران تھے۔ آخر مقدمہ ملتوی کر دیا گیا۔

تمام وکیل عدالت کے باہر خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن ابراہیم لنکن ایک بوڑھی عورت کے ساتھ بیٹھا اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ آخر اگلے دن جب مقدمہ شروع ہوا تو ابراہیم لنکن اٹھا اور بولا "میں اس مقدمے کی کارروائی عام طریقے سے ہٹ کر کروں گا۔ میں جج صاحب اور جیوری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے ایک واقعہ سنانے کی اجازت دیں۔" جب جیوری اور جج نے اس کی اجازت دی تو وہ بولا "میں ایک بہت غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میرے والدین بہت غریب تھے۔ ہمیں کئی کئی وقت فاقے کرنے پڑتے۔ اس غریبی سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے سوچا کہ کیوں نہ کہیں جاکر نوکری تلاش کی جائے۔ یہ سوچ کر میں اپنے گھر کو خیرباد کہہ کر شہر کی طرف چل پڑا۔ جب راستے میں مجھے بھوک نے ستایا تو مجھے ایک کیبن نظر آیا۔ کیبن کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ بھی کوئی خستہ حال شخص ہے۔ میں کیبن سے ملحقہ مکان میں داخل ہو گیا۔" اتنا کہہ کر وہ رکا اور حاضرین اور جیوری پر نظر ڈالی۔ سب بڑے انہماک سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جب میں مکان میں داخل ہوا تو وہاں مجھے ایک شخص نے خوش آمدید کہا۔ میں نے انہیں اپنے حالات بتائے تو اس شخص نے کہا کہ تم جب تک چاہو میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ اس گھر میں اس شخص کے علاوہ اس کی ایک بیوی اور تین بچے تھے دو بچے تقریباً ۷ اور ۹ سال کی عمر کے تھے۔ جبکہ ایک بچہ شیر خوار تھا اور ماں کی گود میں تھا۔ اس شخص کا نام ہینری اور اس کی بیوی کا نام میرینا تھا۔ بچوں کے نام مجھے یاد نہیں۔ میں وہاں چند دن رہا لیکن ان چند دنوں میں وہاں جو میری خاطر ہوئی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ انہوں نے اپنی غریبی کا احساس مجھے بالکل نہیں ہونے دیا۔ مجھے ہر طرح کی آسائش مہیا کی۔ گویا میں بھی ان کا ہی بیٹا ہوں۔ خود وہ فاقے

کرتے لیکن مجھے پیٹ بھر کر کھانا ضرور کھلاتے۔ آخر چند دن بعد میں شہر کی طرف روانہ ہوا اور محنت کرتے کرتے آج اس مقام تک پہنچا ہوں کہ ایک نامور سیاستدان ہوں۔"

یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور پھر اس لڑکے کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم ضرور رہا ہو گے۔" اور پھر اس بوڑھی عورت کی طرف اشارہ کیا جو کل اس سے ملی تھی اور کہا "اپنی ماں کی خاطر ہنس دو۔ کیا تم اس کا افسردہ چہرہ نہیں دیکھ رہے؟" لڑکے نے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی وہ آنسو پونچھتے ہوئے مسکرائی تو جان بھی جبراً مسکرا دیا۔ جج نے ابراہیم لنکن سے پوچھا کہ "اس سارے واقعے کے سنانے کا کیا مقصد ہے؟" ابراہیم بولا "میں یہی بتانے والا تھا یور آنر! دراصل وہ عورت میرینا اس ہال میں بیٹھی ہوئی یہ عورت ہے اس نے جان کی ماں طرف کی اشارہ کرتے ہوئے کہا اور وہ شیر خوار بچہ اس کٹہرے میں کھڑا یہ لڑکا ہے۔"

عدالت میں موجودہ تمام افراد کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے ہر شخص حیران تھا۔ آخر ابراہیم لنکن بولا، "مائی لارڈ۔ یہ لڑکا اس وقت عمر کے اس حصے میں ہے جہاں ہر لڑکے کے ہاتھ میں کتابیں ہوتی ہیں۔ میں تو پھر قسمت کی مہربانی سے ایک کامیاب زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن یہ خوش قسمتی ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی میں عدالت سے درخواست کرتا ہوں کہ اس لڑکے کو باعزت طور پر بری کیا جائے۔" جج نے سوالیہ نظروں سے جیوری کی طرف دیکھا تو جیوری کے اراکین کچھ دیر کے لئے باہر گئے۔ پورے ہال میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کوئی لڑکے کے حق میں تھا اور کوئی چاہتا تھا کہ لڑکے کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔ آخر جیوری کے اراکین واپس آئے تو جج نے پوچھا "آپ نے کیا فیصلہ کیا، بے گناہ یا مجرم؟" جیوری کے اراکین نے جواب دیا "بے گناہ۔" پورے ہال میں فرط مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ لڑکا دوڑ کر اپنی ماں کے سینے جا لگا اور ابراہیم لنکن کو ایسے لگا جیسے وہ جان نہیں بلکہ اس کا اپنا وجود ہے۔

(ماخوذ)

اژدھا کہانی

سید عرفان علی یوسف

"سانپ سانپ سانپ۔" گڈو میاں نے اچانک چلّا کر کہا اور امینہ پوری طاقت سے چیختی چلاتی لان سے برآمدے کی طرف بھاگی۔ امینہ کی چیخیں سن کر امی باورچی خانے سے آئیں تو امینہ ان سے چمٹ گئی۔ امی کے پیچھے بھائی جان بھی اپنے کمرے سے نکل کر آگئے اور بولے۔"کہاں ہے سانپ؟"

سانپ سانپ چلّا کر امینہ کو ڈرانے والے گڈو میاں لان میں جھولا کرسی پر بیٹھے بڑے آرام سے جھولا جھولنے میں مصروف تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ امینہ بہت دیر سے جھولا کرسی پر بیٹھی تھی اور گڈو میاں کو کرسی دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ گڈو میاں کو کرسی خالی کرانے کا اور کوئی نسخہ تو سوجھا نہیں۔

انہوں نے ایک لمبی چھڑی کی مدد سے کرسی کے پیچھے جھولنے والی امینہ کی لمبی چٹیا کو اٹھا کر اس کی گود میں پھینک دیا اور ساتھ ہی سانپ سانپ چلا دیئے۔ امینہ ٹھہری ایک نمبر ڈرپوک۔ اپنی ہی چٹیا سے ڈر گئی اور کرسی چھوڑ کر برآمدے کی طرف بھاگی۔ اس طرح گڈو میاں کو کرسی مل گئی۔

گڈو میاں کو آرام سے جھولا جھولتے دیکھ کر ساری بات بھائی جان کی سمجھ میں آگئی۔ انی نے گڈو میاں کو نا صرف دو چار صلواتیں سنائیں بلکہ ایک تھپڑ بھی لگا دیا جو گڈو میاں نے بونس میں وصول کیا لیکن بُرا نہیں منایا اور جھولا جھولنے میں مصروف رہے۔

بھائی جان نے امینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے "امینہ! تم بہت ڈرپوک ہو۔ لیکن خیر تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آنا۔ میں تم کو سانپوں کے بارے میں کہانی سناؤں گا اس سے تمہارا ڈر دور ہو جائے گا۔" کہانی کا تذکرہ سن کر گڈو میاں کے کان بھی کھڑے ہوئے۔ انہوں نے فوراً کرسی چھوڑ دی اور بولے، "بھائی جان! میں بھی کہانی سنوں گا۔"

تھوڑی دیر میں سب بچے بھائی جان کے کمرے میں جمع تھے۔

"امینہ! تم بلاوجہ سانپوں سے اتنا ڈرتی ہو۔" بھائی جان نے کہا، "اللہ میاں نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی۔ شاید تمہیں سن کر حیرت ہو کہ دنیا میں سانپوں کی جتنی قسمیں پائی جاتی ہیں ان میں صرف تیس فیصد سانپ زہریلے ہوتے ہیں۔"

"لیکن بھائی جان۔" گڈو میاں بولے "یہ کیسے پتا چلے گا کہ کون سا سانپ زہریلا ہے اور کون سا سانپ غیر زہریلا؟"

"تم نے پتے کی بات کہی ہے بھئی گڈو میاں!" بھائی جان نے داد دی، "یہی وجہ ہے کہ سانپوں سے احتیاط کرنی چاہئے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہر وقت سانپوں سے خوف زدہ رہیں۔ بھئی تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ ہندوستان، پاکستان اور آسٹریلیا میں ہر سال زہریلے سانپوں کے ساتھ رہنے کے مقابلے ہوتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں رہنے والے ایک سپیرے نے انتہائی زہریلے سانپوں کے ساتھ بارہ دن گزار کر عالمی ریکارڈ قائم کیا اور اسے کسی سانپ نے نہیں ڈسا۔

"یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے بھائی جان!" امینہ نے کہا۔ "پرسوں ہماری گلی میں جو سانپ والا آیا تھا اس نے اپنے گلے میں ایک سانپ ڈالا ہوا تھا اور وہ سانپ اس کے گالوں پر پیار بھی کر رہا تھا۔ آپ نے دیکھا تھا ناں!"

"ہاں!" بھائی جان بولے۔ "لیکن اس کے گلے میں جو چتکبرا سانپ تھا وہ اصل میں اژدہا تھا۔ اژدہے زہریلے نہیں ہوتے۔ ان کے گلے میں زہر کی تھیلی نہیں ہوتی۔ ہاں! ان کے دانت بہت تیز ہوتے

ہیں۔" "بھائی جان!" گڈو میاں بولے، "میں نے چڑیا گھر میں بھی ایک بڑا اژدہا دیکھا تھا۔ آپ اژدہے کے بارے میں تفصیل سے بتایئے ناں!"

"اچھا تو سنو!" بھائی جان نے کہنا شروع کیا، "اژدہے انسانوں کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہوتے ہیں کیونکہ وہ ہماری فصلوں کو نقصان پہنچانے والے کیڑے مکوڑوں اور چوہوں وغیرہ کو کھا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں کسان اژدہے پالتے ہیں۔ سانپ تو زمین میں سوراخوں اور بلوں میں رہتے ہیں لیکن اژدہے زیادہ تر درختوں یا پہاڑی غاروں وغیرہ میں رہتے ہیں۔ سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ اژدہے کبھی بیمار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طبعی موت نہیں مرتے اور ان کی عمریں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اژدہوں کی موت زیادہ تر جنگل کے دوسرے زہریلے جانوروں مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ کے کاٹ کھانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اکثر بارہ سنگھا اور لمبے سینگوں والے ہرن بھی اژدہے کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اژدہا جب کسی بارہ سنگھے یا لمبے سینگوں والے ہرن کو نگل لیتا ہے تو یہ سینگ اس کے حلق میں پھنس جاتے ہیں اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا ہے۔"

"بھائی جان۔" امینہ بولی، "اس کا مطلب یہ ہوا کہ اژدہا اپنے شکار کو ثابت نگل جاتا ہے۔" "ہاں، تم صحیح سمجھی ہو۔" بھائی جان بولے، "لیکن اژدہے سردیوں کے موسم میں کھانا نہیں کھاتے۔ سرد علاقوں میں خاص طور پر سرما ان کے سونے کا موسم ہوتا ہے۔ اس موسم میں وہ سرمائی نیند کے لئے گہرائی میں چلے جاتے ہیں جہاں وہ پورے سردیوں کے موسم میں بغیر کھائے پیئے پڑے رہتے ہیں جب موسم بدلتا ہے تو وہ زمین سے باہر نکل آتے ہیں۔

اژدہوں کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ انسانوں کی طرح ان کے بھی دو پھیپھڑے ہوتے ہیں۔ حالانکہ عام سانپوں کا ایک ہی پھیپھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح اژدہوں میں پاؤں کی ہڈیاں بھی نامکمل حالت میں موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ آج سے لاکھوں سال پہلے اژدہوں کے پاؤں ہوا کرتے تھے اور چین میں تو آج کل بھی پاؤں والے اژدہوں کی تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ جب اژدہوں نے رینگ کر سوراخوں اور غاروں میں گھسنا شروع کیا تو ان کے ہاتھ پاؤں استعمال نہ ہونے کے باعث گھس کر بے کار ہوگئے اور وقت گزرنے کے ساتھ غائب ہوگئے۔

سبھی اژدہے بہت اچھے تیراک ہوتے ہیں۔ بعض اژدہے تو پانی میں تیرنے کے ایسے شوقین ہوتے ہیں کہ کئی کئی ماہ پانی ہی میں پڑے رہتے ہیں اور کبھی کبھار ہی خشکی پر آتے ہیں۔ جنوبی امریکہ میں اژدہوں کی ایک قسم، ان کونڈا، پائی جاتی ہے۔ یہ اژدہے اکثر اپنا پیٹ بھرنے کے لئے دریا میں اتر جاتے ہیں۔ مگرمچھ کے انڈے اور بچے ان کی مرغوب غذا ہیں۔ ویسے تو اژدہے بڑے مگرمچھ کو بھی کھا جاتے ہیں، یہ اور بات

ہے کہ بڑا مگرمچھ ان کے ہاتھ مشکل ہی سے آتا ہے، لیکن جنگل کے جس حصے میں اژدہے رہتے ہیں مگرمچھ وہاں سے بھاگ لیتے ہیں۔ عام طور پر اژدہوں کا شکار چھوٹے دودھ پلانے والے جانور مثلاً خرگوش، بندر، بکریاں، چوہے، بلی اور پرندے ہوتے ہیں۔ تاہم ان کی غذا مخصوص نہیں ہے وہ جب بھوکے ہوتے ہیں تو انہیں جو کچھ مل جائے اسے نگل جاتے ہیں۔ اپنے سے بڑے جانوروں کو وہ پہلے ان کے گرد لپٹ کر انہیں مار ڈالتے ہیں اور اس کے بعد اطمینان سے کھاتے ہیں۔"

"لیکن بھائی جان" گڈو میاں بولے، "اژدہا اپنے سے بڑے جانوروں کو آخر کیسے نگلتا ہے۔" "بھئی بات یہ ہے۔" بھائی جان بولے، "اژدہے کی گردن کے جوڑ اور ہڈیاں بہت لچکیلی ہوتی ہیں۔ اژدہے کی ریڑھ کی ہڈی گردن کو موڑنے اور ہر طرف آسانی سے گھمانے میں مدد دیتی ہے۔ اژدہے کے جبڑے کا نچلا حصہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ یہ دونوں حصے پٹھوں اور کھال کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اژدہے کا منہ بظاہر بہت چھوٹا نظر آتا ہے لیکن شکار کے وقت یہ چھوٹا منہ غار کی طرح کھل جاتا ہے اور بڑے سے بڑا شکار بھی آسانی سے اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ میں نے ایک شکاری کی کہانی پڑھی تھی۔ اس نے ایک اٹھارہ فٹ لمبا اژدہا پال رکھا تھا جو روزانہ چار چار فٹ لمبے بازوؤں والی سات بڑی چمگادڑیں کھایا کرتا تھا۔ اس نے جنگل میں ایک اژدہا دیکھا جو ایک وقت میں ایک ساتھ ایک ہرن، ہنس، خرگوش اور جنگلی مرغ نگل گیا۔

مادہ اژدہا انڈے دیتی ہے جو تعداد میں دس سے پندرہ تک ہوتے ہیں۔ یہ انڈے آپس میں چپکے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا اوپری خول اتنا سخت ہوتا ہے کہ آسانی سے توڑا نہیں جاسکتا۔ ان انڈوں کا سب سے بڑا دشمن عقاب ہے جو اژدہوں کے انڈے پنجوں میں دبا کر اوپر اڑ جاتا ہے اور بلندی سے چٹانوں پر گراتا ہے تاکہ خول ٹوٹ جائے اور اندر کے مواد کو وہ کھا جائے۔

بھئی! اپنی تمام برائیوں اور دہشت ناکی کے ساتھ اژدہا انسانوں کا دوست اور خادم بھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اسے سلیقے سے سدھایا جائے۔ بعض ملکوں میں کسان اژدہے پالتے ہیں کیونکہ اژدہا چوہوں کا دشمن ہے اور انہیں تلاش کر کے شکار کرتا ہے تمہیں پتہ ہے کہ چوہے اناج کے دشمن ہیں۔ ہر سال دنیا میں چوہے کروڑوں من اناج چٹ کر جاتے ہیں اور ہر سال لاکھوں بچے اناج کی قلت کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔" "بھائی جان، بھائی جان۔" گڈو میاں بھائی جان کے گلے میں لٹکتے ہوئے بولے۔

"میرے لئے ایک اژدہا لا دیجئے نا۔"

"چلو بدتمیز۔" امینہ گڈو میاں کو ایک دھپ لگاتے ہوئے بولی، "تمہارے ہوتے ہوئے کسی اژدہے کی کیا ضرورت ہے۔"

(انتخاب ادارہ)

(فلسطین کی لوک کتھا)

عورت جس کا نام فیرنی تھا

ایک عورت تھی۔ اس کا نام تھا کنفیوشہ۔ ایک بار ایک درویش اس کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ وہ ایک بڑی تسبیح گلے میں پہنے ہوئے تھا۔ کافی موٹا تازہ۔ کنفیوشہ اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور اس سے پوچھا "تم کیا بیچتے ہو؟"

"نام" اس نے جواب دیا۔

"نام؟" کنفیوشہ نے کہا۔

"ہاں میں نام بیچتا ہوں۔"

"ایک نام کے کتنے پیسے لیتے ہو؟" کنفیوشہ نے پوچھا۔

"پانچ سو دینار۔" اس نے کہا۔

کنفیوشہ کی کل بچت اتنی ہی تھی۔ اس نے گھر سے پانچ سو دینار لا کر درویش کو دیئے۔ اس نے کہا۔ "آج سے تمہارا نام فیرنی ہوگا۔"

شام میں کنفیوشہ کا شوہر گھر آیا۔ اس نے کنفیوشہ کو آواز دی "کنفیوشہ! کنفیوشہ! باہر گاڑی کھڑی ہے۔ سامان اتار لو۔"

کنفیوشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے پھر کنفیوشہ کو آواز دی۔

جواب ندارد۔

"کیا بات ہے کنفیوشہ۔" اس نے کہا "تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟"

"میرا نام فیرنی ہے۔" کنفیوشہ نے کہا۔ "فیرنی!"

"ہاں فیرنی" کنفیوشہ نے کہا۔

"یہ نام تمہیں کس نے دیا؟" شوہر نے پوچھا۔

"ایک فقیر نے۔" کنفیوشہ نے جواب دیا "ایک فقیر یہاں سے گزرا تھا وہ نام بیچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پانچ سو دینار میں یہ نام خرید لیا۔"

"پانچ سو دینار میں!" کنفیوشہ کے شوہر نے حیرت سے پوچھا۔

کنفیوشہ نے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

کنفیوشہ کے شوہر کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اپنا کوٹ پہنا اور کنفیوشہ سے کہا۔

"میں جارہا ہوں، اور اس وقت تک گھر واپس نہیں آؤں گا جب تک مجھے تم سے زیادہ کوئی بے وقوف عورت نہیں مل جاتی۔"

وہ گھر سے نکلا اور بہت دنوں تک گھومتا رہا۔ جب بھی کوئی فقیر اسے ملتا وہ اس سے پوچھتا تم نام فروش تو نہیں ہو۔ وہ جواب میں کہتا "نہیں۔"

ایک دن وہ سڑک پر جارہا تھا۔ اسے ایک عورت ملی۔ عورت نے اس سے پوچھا "کہاں سے آرہے ہو؟"

"جہنم سے۔" اس نے جواب دیا۔

"وہاں تم نے میرے باپ کو دیکھا تھا؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں دیکھا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"کس حال میں ہے؟"

"بہت بُرے حال میں۔"

"کیا تم واپس جارہے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"کچھ تحفے لے جاؤ گے میرے باپ کے لئے؟" عورت نے کہا۔

"کیوں نہیں۔"

عورت اسے گھر لے گئی۔ کچھ مکھن، کچھ پنیر اور اپنے شوہر کا ایک کوٹ دیا۔ اس نے بڑے

اطمینان سے سب چیزوں کی گٹھڑی بنائی اور چل پڑا۔

اس عورت کا شوہر جب گھر آیا تو کھانے کے بعد اس کا جی چاہا کہ قہوہ خانے جاکر دوستوں میں گپ شپ کرے۔ اس نے عورت سے کہا کہ وہ اس کا کوٹ نکال دے۔

عورت نے کہا وہ تو میں نے ایک شخص کو دے دیا۔

آدمی نے حیرت سے پوچھا "کیوں؟"

"وہ آدمی کہہ رہا تھا میں جہنم سے آیا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہاں اس نے میرے باپ کو دیکھا تھا۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ وہاں وہ بہت بُری حالت میں ہے۔ اس لئے میں نے اسے کچھ مکھن، کچھ پیسے اور تمہارا کوٹ دے دیا کہ میرے باپ کو دے دے۔

"باپ رے۔" اس آدمی نے کہا "وہ کس طرف سے گیا ہے؟"

عورت نے اشارہ کیا اور وہ فوراً باہر دوڑا، اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اسی راستے پر چل پڑا۔ کئی گھنٹوں کے بعد ایک شخص اسے ملا۔ وہ دراصل کنفیوشہ کا شوہر ہی تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر گٹھری دیوار کے ایک سوراخ میں چھپا دی اور اس سے ٹیک لگا کر انجان بن کر کھڑا ہو گیا۔

وہ آدمی کنفیوشہ کے شوہر کے قریب آیا اور اس سے پوچھا۔

"بھائی تم نے کسی شخص کو مکھن اور کوٹ لے جاتے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں۔" کنفیوشہ کے شوہر نے جواب دیا۔

"بہت دور تو نہیں گیا ہو گا؟" اس آدمی نے پوچھا۔ کیا میں اسے پکڑ سکتا ہوں؟"

"جی ہاں، اگر آپ گھوڑے سے اتر کر پیدل چلیں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ گھوڑے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور آدمی کی دو ٹانگیں، دو ٹانگیں ایک دوسرے سے فوراً ہم آہنگ ہو جاتی ہیں مگر چار ٹانگوں کو وقت لگتا ہے۔ جب تک چار ٹانگیں ایک دوسرے سے تال میل پیدا کریں گی۔ وہ شخص بہت دور نکل چکا ہو گا۔"

"کیا تم میرا یہ گھوڑا سنبھال لوگے۔ جب تک کہ میں واپس آؤں؟" اس آدمی نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں۔" کنفیوشہ کے شوہر نے جواب دیا۔

جیسے ہی وہ آدمی نظروں سے اوجھل ہوا۔ کنفیوشہ کا شوہر گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے نکلا اور گھر پہنچتے ہی اس نے باہر سے آواز لگائی: "فیرنی میں آگیا۔"

اِن پر اعتماد کیجیے

اِن سے تعاون کیجیے

وطنِ عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے

آنکھ مچولی

پہنچانے کے لیے ہم نے

اِن اداروں کو
اپنا باقاعدہ ایجنٹ
مقرر کیا ہے

محمد حسین برادرز	کراچی ۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور - ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی - ۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد - ۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور - ۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان - ۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد - ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ - ۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ
سلمان برادرز	نوابشاہ - ۲۴۱۴
سعید بک سٹال	گجرات - ۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈز بکسٹال	سرگودھا - ۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور - ۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان - ۲۶۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر
رحمت بکسٹال	اوکاڑہ
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ - ۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال

آنکھ مچولی خریدنے کے لیے
اپنی تجاویز اور مشوروں کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

خط و کتابت کے لیے

ماہ نامہ **آنکھ مچولی** - ڈی ۱۱۲ - سائٹ • کراچی ۱۶

قلم قلم

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

ایک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔ (ادارہ)

مٹی کا گھروندا

بنا معلوم

ہاں۔ اب مشکل آپڑی۔ آخر مینہ بھی تو برساہی کرتا ہے۔ اس وقت کیا کریں گے اس خیال کے ساتھ ہی اپنے مٹی کے گھروندے کی حقیقت کا پتہ چل گیا۔ اور اصل گھر کا خیال آیا۔

یہ مٹی کا گھروندا ہے
اسے ہم نے بنایا ہے
یہ سونے کے ہیں دو کمرے
یہ ان کمروں کے دروازے ہیں
یہ لمبا سا جو کمرا ہے
بتاؤ تو بھلا۔ کیا ہے؟
اسے دالان کہتے ہیں
ہم اس میں بیٹھے رہتے ہیں
ادھر اک غسل خانہ ہے
ادھر باورچی خانہ ہے
یہ آنگن ہے یہ ہے ڈیوڑھی
ادھر دیوان خانہ بھی
کتابیں اپنی لائیں گے
یہ کمرہ ہم سجائیں گے
مگر برسے گا مینہ جس دم
کہاں جاکر چھپیں گے ہم
اجی یوں فکر کرتے ہو
بھلا کا ہے کو ڈرتے ہو
چلے جائیں گے اپنے گھر
وہاں مینہ کا نہیں ہے ڈر
ادھر پانی جب آئے گا
گھروندا ٹوٹ جائے گا
چلو جی پھر بنالیں گے
یہ دیواریں اٹھالیں گے

یہ مٹی کا گھروندا ہے
اسے ہم نے بنایا ہے

سکے کی واپسی

مرسلہ: محمد ادریس قریشی

ایک تھی وادی۔ جس کے تین طرف بہت اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ اور چوتھی طرف دریا بہتا تھا۔ اس وادی میں رہنے والے لوگ سیدھے سادھے تھے۔ یہ وادی بہت سرسبز تھی۔ وادی کے لوگ کبھی وادی سے باہر نہیں نکلے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان پہاڑوں کے دوسری طرف کیا ہے۔ وہاں کے لوگ روپے پیسے کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ وہ غلے کے بدلے میوہ۔ کھجور کے بدلے دودھ یعنی چیز کے بدلے میں چیز ایک دوسرے سے لے لیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی خوبی یہ تھی کہ وہ کبھی بھی آپس میں نہ لڑتے تھے۔ خوش اخلاق ملنسار اور مہمان نواز تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسی وادی کا ایک کوہ پیما اپنے دوسرے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ وہ اس وقت ایک ویران علاقے میں کھڑا تھا۔ جہاں اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ کوہ پیما نے سوچا کہ مجھے پہاڑ پر چڑھ کر اپنے ساتھیوں کو دیکھنا چاہئے۔ وہ نصف پہاڑ پر چڑھ گیا۔ مگر دور دور تک اسے کوئی نظر نہ آیا۔ پھر وہ نیچے اترنے لگا۔ تو اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھے کہ اس کے دوسری طرف کیا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اوپر چڑھ گیا اور دوسری طرف چلتے پھرتے لوگ اور ہر طرف لہلہاتے کھیت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس وادی کو پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔ اب کوہ پیما کو بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی تو اس نے سوچا کہ اس وادی کے لوگوں سے پیسوں کے عوض کچھ کھانے کو مانگا جائے۔ کوہ پیما کی جیب میں اس وقت چند سکے موجود تھے۔ کوہ پیما جب وادی میں اترا۔ تو وادی کے لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہوئے۔ کوہ پیما نے ان سے کہا کہ مجھے کچھ کھانے اور پینے کو دو۔ اس نے اپنی جیب سے سکے نکال کر انہیں دیئے تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگے۔

اب یہ بات پوری وادی میں پھیل چکی تھی کہ پہاڑوں سے اس پار کا ایک انسان وادی میں آگیا ہے۔ اور وہ ہم سے کھانے کی چیزوں کے بدلے میں ہمیں لوہے کے ٹکڑے دینا چاہتا ہے۔ وادی کا سردار زاران وادی کے لوگوں کے ساتھ اس شخص کے پاس گیا۔ اور اس سے

پہاڑوں سے اس پار کی دنیا کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کوہ پیما نے زاران سے کہا کہ میں بھوکا اور پیاسا ہوں۔ پہلے مجھے کچھ کھانے اور پینے کو دو۔ پھر میں تمہیں اس دنیا کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ "سردار! یہ لوہے کے گول ٹکڑے ہمیں اس شخص نے دیئے ہیں۔" وادی کے ایک شخص نے یہ کہہ کر سکے سردار کو دے دیئے۔ سردار نے انہیں غور سے دیکھا اور پھر تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ یہ کیا ہے۔ کوہ پیما نے انہیں بتایا یہ ہمارے بادشاہ کی تصویر ہے۔ "بادشاہ کیا ہوتا ہے۔" ایک شخص نے معصومیت سے پوچھا۔ "بادشاہ سردار کو کہتے ہیں۔" کوہ پیما نے بتایا۔ تو ایک شخص حیران ہو کر بولا "لیکن ہمارا سردار تو یہ ہے۔" "نہیں! یہ تصویر بڑے سردار کی ہے تمہارے سردار سے بھی بڑے سردار کی۔" یہ سن کر لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر اپنے سردار سے بھی بڑے سردار کی تصویر کو دیکھنے کیلئے آ گئے۔ وہ بڑے احترام سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ پھر سردار زاران نے کوہ پیما کو اپنا مہمان بنا لیا۔ اور اس کی خوب خاطر تواضع کی۔ اگلے دن کوہ پیما دریا کے راستے چلا گیا۔ وہ سکے سردار کے پاس ہی تھے۔ پوری وادی کے لوگ جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ ان کا کیا کیا جائے۔ آخر سردار بولا ہم یہ تصویر بڑے سردار کے پاس تحفے کے طور پر لے جاتے ہیں۔ وہ خوش ہو کر ہمیں انعام دے گا۔ اب یہ فیصلہ ہو گیا۔ چار ڈنڈوں کے اوپر باریک جالی والا کپڑا تانا گیا اس پر ایک سکہ رکھا گیا۔ باقی سکے وادی میں ہی رہنے دیئے گئے۔ اب وادی کے سردار سمیت چار آدمی سفر پر روانہ ہوئے انہوں نے ایک ایک ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ وہ چاروں لکڑی کے ایک چپٹے تختے پر سوار ہوئے اور دوسرے کنارے پر جا کر اتر گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک سڑک نظر آ گئی۔ وہ اس پر چل پڑے اور لوگوں سے پوچھتے پچھاتے بادشاہ کے محل کے سامنے پہنچ گئے۔ محل کے دروازے پر موجود دربان نے انہیں روک لیا۔ تو سردار نے بتایا کہ۔ "ہم بادشاہ کو ایک تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اندر جانے دیا جائے۔" دربانوں نے انہیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ پھر انہوں نے دوسرے لوگوں کی طرح بادشاہ کو سلام کیا۔ وہ بادشاہ کو پہچان گئے تھے۔ کیونکہ اس کی تصویر سکے پر دیکھ چکے تھے۔ اب بادشاہ نے پوچھا کہ تم مجھے کیا تحفہ دینا چاہتے ہو۔ انہوں نے بڑے ادب سے ڈنڈوں پر تنے ہوئے کپڑے پر سے سکہ اٹھانا چاہا۔ مگر یہ کیا سکہ تو وہاں تھا ہی نہیں تختہ پر بیٹھتے ہوئے شاید دریا میں ہی گر گیا ہو گا۔ جب انہوں نے بادشاہ کو کوئی تحفہ نہ دیا تو بادشاہ غصے سے بولا انہیں شاہی جیل میں بند کر دو انہوں نے میرے ساتھ مذاق کیا ہے۔ ان لوگوں نے لاکھ اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر انہیں جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ جب رات ہوئی تو ان کی کوٹھڑی میں چند لکڑیاں اور ماچس رکھ دی گئی۔ تاکہ وہ آگ تاپ سکیں۔ صبح جب جیل کا داروغہ اندر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماچس اور لکڑیاں اسی طرح پڑی ہیں اور وہ چاروں سردی سے کانپ رہے ہیں۔ دراصل وہ ماچس سے واقف نہیں تھے۔ وہ

پتھروں کو رگڑ کر ہی آگ جلانا جانتے تھے۔ داروغہ نے یہ بات بادشاہ کو بتائی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ کوئی بے وقوف ہوں گے۔ اس لئے اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ چھٹتے ہی وہ چاروں اپنی وادی کی طرف بھاگے۔ وادی میں پہنچ کر انہوں نے سب کو بتایا کہ خبردار! وادی سے باہر کوئی نہ جائے۔ اپنی وادی ساری دنیا سے اچھی ہے۔

چار چور ایک بادشاہ

عزیز احمد شیخ راہی

سلطان محمود غزنوی عادت کے مطابق رات کو اپنا بھیس بدل کر شہر کا گشت کر رہے تھے کہ آپ نے ایک جگہ چند چور دیکھے جو کہیں چوری کرنے جا رہے تھے۔سلطان محمود کو دیکھ کر وہ ڈر گئے اور پوچھنے لگے تم کون ہو۔

آپ نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں، چور سمجھ بیٹھے کہ یہ کوئی ہماری طرح چور ہی ہے اور یہ سمجھ کر مطمئن ہوگئے۔ سلطان محمود ان میں شامل ہوگئے اور ان چوروں سے فرمایا اتنی رات گئے تمہارا گھر سے نکلنے کا مقصد کیا ہے؟ وہ بولے "وہی جو تمہارا ہے یعنی چوری کرنا" سلطان نے فرمایا "اگر چوری کرنا ہے تو پھر شاہی محل کو لوٹو وہاں سے بہت بڑا خزانہ ہاتھ آئے گا جو عمر بھر کے لئے ہمیں مالدار بنا دے گا۔" چوروں نے یہ مشورہ سن کر سلطان محمود کی ہمت و جرأت کی داد دی اور کہا "بڑے دلیر چور ہو کہ شاہی محل میں چوری کرنے سے بھی نہیں ڈرتے تو آج سے تم ہمارے سردار ہو اور ہم تمہارے تابعدار لیکن یہ کام ہے بڑا مشکل۔" سلطان نے کہا "ڈرو مت اور کسی

مشکل کو مشکل نہ سمجھو تیار ہو جاؤ آج شاہی محل ہی کو لوٹا جائے گا۔ لیکن پہلے یہاں بیٹھ کر ایک منصوبہ تیار کر لو اور اپنا اپنا کمال بیان کرو ہم میں سے ہر ایک بتائے کہ وہ کیا خصوصی کمال رکھتا ہے۔" چنانچہ وہ وہیں بیٹھ گئے ایک چور بولا "مجھ میں یہ کمال ہے کہ میں اندھیری رات میں بھی کسی کو دیکھ لوں تو دن کو بغیر کسی وقت کے پہچان لیتا ہوں" دوسرا بولا "مجھ میں یہ کمال ہے کہ میرے بازوؤں میں اتنی قوت ہے کہ محل چاہے کتنا اونچا ہو میری پھینکی ہوئی کمند دیوار کے کنگرے کو پکڑ لیتی ہے اور ہم سب با آسانی اوپر چڑھ سکتے ہیں۔" تیسرے نے کہا "مجھے یہ کمال حاصل ہے کہ خزانہ زمین کے جس حصے میں دبایا گیا ہو میں اپنی ناک سے مٹی سونگھ کر یہ معلوم کر لیتا ہوں کہ اس جگہ خزانہ دبایا گیا ہے۔ چوتھا بولا "مجھے یہ کمال حاصل ہے کہ میں کتے کی آواز سن کر سمجھ لیتا ہوں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے" اب وہ سلطان محمود سے پوچھنے لگے ہم تو اپنا اپنا کمال بیان کر چکے اب تم بتاؤ تم کیا کمال رکھتے ہو۔ آپ نے یہ فرمایا "مجھ میں یہ کمال ہے اگر مجرم قید میں ہوں اور جلاد انہیں قتل کرنے کے لئے تختہ دار پر بھی لے آئیں لیکن میں اپنی داڑھی ہلا دوں تو سارے مجرم قید سے رہا ہو جائیں اور مرنے سے بچ جائیں۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا "واہ کیا کمال ہے واقعی تمہارا کمال سب سے بڑا ہے آج سے تم ہمارے سردار ہو کیونکہ تیرا وجود ہماری رہائی کا ضامن ہے۔" اب وہ اٹھے اور شاہی محل کی طرف چلے۔ راستے میں ایک کتے نے انہیں دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا وہ چور جسے کتے کی زبان سمجھنے کا کمال تھا سب اس سے پوچھنے لگے "بتاؤ یہ کتا کیا کہہ رہا ہے۔" وہ بولا بھائیوں جو کچھ کتا کر رہا ہے میں خود بڑا حیران ہوں کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تم بھی سنو گے تو یقین نہیں کرو گے مگر بخدا کتا جو کچھ کہہ رہا ہے میں سمجھ رہا ہوں اس نے کہا ہے کہ ان پانچوں میں بادشاہ خود بھی موجود ہے سارے ہنسنے لگے اور بولے "بے وقوف کہیں کا بادشاہ اور ہم میں یہ کیسے ہو سکتا ہے اس نے کہا "ممکن ہے کتے کا مقصد یہ ہو کہ ہم شاہی محل لوٹنے جا رہے ہیں اس لئے پانچوں میں سے ایک کیا ہو سکتا ہے کل ہم پانچوں بادشاہ ہوں۔" آگے بڑھے تو شاہی محل کے پاس پہنچے کمند پھینکنے والے سے کہنے لگے اپنا کمال دکھاؤ اس نے رسی پھینکی جو محل کی دیوار سے اٹک گئی اور یہ سب رسی کے ذریعہ اوپر چڑھ گئے اب زمین سونگھنے والے سے کہا کہ زمین سونگھ کر بتاؤ کہ خزانہ کس جگہ موجود ہے چنانچہ اس نے بھی اپنا کمال دکھایا اور زمین سونگھ کر شاہی محل کا جتنا خزانہ تھا معلوم کر لیا خزانہ لوٹ کر اسی رسی کے ذریعہ

محل سے باہر نکل آئے اور شہر سے باہر کسی ویران جگہ میں بیٹھ کر خزانہ تقسیم کرنے لگے۔ سلطان محمود نے ان سے کہا "تم مجھے سردار تسلیم کر چکے ہو میری بات مانو اور خزانہ کی تقسیم فی الحال ملتوی کر دو کیونکہ اگر یہ خزانہ تقسیم کر کے اپنے حصے کا مال ہم اپنے گھر لے گئے اور صبح جب شاہی خزانہ کی چوری کا پتہ چلا تو ممکن ہے بادشاہ چور پکڑنے کے لئے شہر کی تلاشی کا حکم دے اور ہم پکڑے جائیں اس لئے کچھ دنوں کیلئے صبر کرو اور خزانہ یہیں زمین کھود کر دفن کر دو پولیس کو دوڑ دھوپ اور اپنی کوشش کر لینے دو جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو ہم اطمینان سے یہاں آکر خزانہ کھود کر تقسیم کر لیں گے۔" سب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور کہا "بالکل ٹھیک ہے ہم آپ کے تابعدار ہیں جو حکم ہو ہمیں منظور ہے۔" سلطان محمود فرمانے لگے "اب ہم سب اپنے اپنے گھر روانہ ہوتے ہیں لیکن میں تم میں نیا ہوں، میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو لہٰذا اپنا اپنا مکمل پتہ مجھے لکھوا دو چنانچہ انہوں نے مکمل پتے دے دیئے اور چور اپنے اپنے گھر اور بادشاہ اپنے محل آگیا۔ صبح ہوئی تو ایک شور مچ گیا کہ شاہی خزانہ لوٹ لیا گیا ہے۔ پولیس بھاگ دوڑ کرنے لگی تو سلطان محمود نے ان چاروں چوروں کے پتے بتا دیئے اور کہا "ان چاروں کو گرفتار کر لو یہی چور ہیں۔" پولیس ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچی اور چاروں کو گرفتار کر لیا وہ چاروں چور بڑے حیران ہوئے کہ یہ قصہ کیا ہے ہماری مخبری کس نے کی ہم چاروں تو پکڑے گئے مگر ہمارا سردار گرفتار نہیں ہوا یہ کیا بات ہے عدالت میں پیش ہوئے تو شاہی مجرم ہونے پر انہیں پھانسی کا حکم سنا دیا گیا اب تو وہ بہت گھبرائے اور اپنے سردار کو یاد کر کے اور بھی پریشان ہو گئے کہ اب وہ ہمارے خزانے کا خود مالک بن بیٹھے گا۔ پھانسی کے لئے جب انہیں لے جانے لگے تو سلطان محمود نے حکم دیا کہ ان چاروں چوروں کو میرے حضور پیش کیا جائے تاکہ یہ کوئی اپنی آخری تمنا رکھتے ہوں تو پوری کی جاسکے چاروں چور دربار سلطانی میں حاضر کئے گئے سلطان محمود تاج پہنے تخت پر جلوہ افروز تھے۔ وہ چور جسے یہ کمال حاصل تھا کہ جسے اندھیری رات میں ایک بار دیکھ لے صبح بغیر دقت کے اسے پہچان لیتا تھا اس نے تخت پر بیٹھے ہوئے سلطان کو غور سے دیکھا تو فوراً پہچان لیا اور اپنے ایک ساتھی کے کان میں کہنے لگا "لو بھئی رات کو کتا سچ ہی کہہ رہا تھا کہ ان میں بادشاہ بھی موجود ہے یہ سامنے تخت پر جو بیٹھا ہے یہی تھا ہمارے ساتھ رات کو۔" دوسرے ساتھی نے کہا "ارے بیوقوف کیا بکتے ہو رات کو کتے کی زبان کا ترجمہ کر کے چور کو بادشاہ بنا دیا اور

اس وقت تم بادشاہ کو چور بنا رہے ہو ان کی کسر پھسر سن کر بادشاہ نے کہا "یہ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہو۔" رات کو دیکھے ہوئے کو دن میں پہچان لینے والا آگے بڑھا اور کہنے لگا "اے ہمارے سردار اپنی داڑھی کب ہلاؤ گے کیا اس وقت جب ہم پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں گے ہم نے اپنا کمال دکھا دیا اب تم بھی اپنا کمال دکھاؤ اور ہمیں پھانسی سے بچاؤ۔" سلطان محمود یہ سن کر ہنس دیئے اور فرمایا پہچان لیا تم نے مجھے لو اپنی داڑھی ہلاتا ہوں جاؤ تم سب کو رہا کیا جاتا ہے۔ سب کو رہا کر دیا گیا اسی وقت وہ سلطان کے قدموں میں گر گئے اور اپنی بُری عادت چھوڑ کر نیک اور صالحہ بن گئے۔

بچو! تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ جب کہیں اچانک آگ لگ جاتی ہے تو فوراً فائر بریگیڈ کی گاڑیاں ٹن ٹن کرتی موقعے پر پہنچ جاتی ہیں اور تھوڑی ہی دیر میں آگ پر قابو پا لیتی ہیں۔ تم سوچو کہ پہلے زمانے میں جبکہ اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی۔ آج کل کی طرح نہ تو موٹر گاڑیاں تھیں اور نہ ہی آنے جانے کے لئے کوئی دوسری سواری لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ اس وقت لوگ آگ بجھانے کے لئے یقیناً کنویں، تالاب اور ندی نالوں کی طرف بھاگتے رہے ہوں گے اور پانی برتن میں بھر بھر کر پھینکتے رہے ہوں گے۔ اب تم خود بتاؤ کہ پہلے زمانے کا وہ طریقہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ رہا ہو گا۔

لیکن تم نے یہ بھی سنا ہو گا کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔" انسان کو جب بھی جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی اس نے اس کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بغیر کامیابی حاصل کئے چین سے نہیں بیٹھا لہٰذا جب لوگوں کو آگ بجھانے میں دشواری محسوس ہوئی تو لوگ کوشش میں لگ گئے کہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے جس سے آگ پر فوراً قابو پایا جا سکے۔ اتفاق کی بات اسی

زمانے میں لندن میں بھیانک آگ لگ گئی۔ کافی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے کافی مکانات راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر ایک سائنس دان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی اور اس نے دنیا کی سب سے پہلی آگ بجھانے والی گاڑی تیار کی۔

یہ ضرور ہے کہ اس گاڑی میں اور آج کی فائر بریگیڈ میں کافی فرق تھا۔ اس نے جو گاڑی بنائی تھی وہ ایک لمبی بگھی تھی جس کو پانچ طاقتور گھوڑے کھینچتے تھے۔ اس گاڑی میں آگ بجھانے کے لئے پانی سے بھری ہوئی لوہے کی ایک بڑی ٹنکی ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ جیسے ہی کہیں آگ لگنے کی خبر ملتی فوراً اس بگھی کو تیز دوڑا کر اس جگہ تک لے جایا جاتا تھا اور بھری ہوئی ٹنکی سے پانی نکال کر آگ پر پھینکا جاتا تھا۔

آگ بجھانے میں اس طرح کچھ آسانی تو ضرور ہوئی مگر پوری طرح سے کامیابی اب بھی نہیں مل سکی تھی۔ بہرحال یہ طریقہ رائج رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ پہلے ٹنکی سے پانی نکالنا پڑتا تھا۔ اب اس میں ایک لمبا پائپ جوڑ دیا گیا۔ اس وقت آج کی طرح انجن اور موٹر تو تھی نہیں اس لئے ربڑ کے پائپ کے ذریعے ہاتھوں سے پمپ میں پانی بھر کر آگ پر پھینکا جاتا تھا۔ اس ترکیب سے ۱۰ میٹر اونچائی تک پانی پھینکا جاسکتا تھا۔

یہ سلسلہ ۱۸ ویں صدی تک چلتا رہا لیکن اسی زمانے میں امریکہ کے نیو یارک شہر میں سرکار نے کچھ اچھی گاڑیاں بنوائیں اور بھی کچھ تبدیلیاں کیں۔ دھیرے دھیرے آگ بجھانے والی گاڑی کی شکل بدلتی گئی اور جیسے ہی موٹر کی ایجاد ہوئی بگھی کی جگہ موٹر نے لے لی اور اس طرح بدلتے بدلتے آج فائر بریگیڈ گاڑی بن گئی۔

فکر انگیز باتیں

کاشف ہارون، کراچی

☐ ...... چار چیزوں کو تھوڑا نہ سمجھو۔
(۱) قرض (۲) مرض (۳) دشمنی (۴) آتش

☐ ...... تین چیزیں سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔
(۱) قلم (۲) قسم (۳) قدم

☐ ...... قوم کی ترقی کے چار اسباب ہیں۔
(۱) اتحاد (۲) علم (۳) دولت (۴) طاقت

☐ ...... ان تین چیزوں کا خوف انسان کے اوسان خطا کر دیتا ہے۔
(۱) شیر (۲) سانپ (۳) چور

☐ ...... قہرالٰہی تین صورتوں میں ہوتا ہے۔
(۱) قحط (۲) وباء (۳) جنگ

ذہنی آزمائش

کاشف شمیم، کراچی

☐ ...... یہ قبر صابر صاحب کی ہے۔
☐ ...... ایک شخص کوریا کاری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔
☐ ...... پرانے زمانے کے نائی جراحی بھی کیا کرتے تھے۔
☐ ...... اگلے سوموار ساجد کی سالگرہ ہے۔
☐ ...... مجھ کو یتیم بچوں کی امداد کر کر خوشی حاصل ہوتی ہے۔
☐ ...... شیخ سلمان بن غازی شہر کے مشہور تاجر ہیں۔
☐ ...... اسلام سے پہلے تمام عرب برائیوں اور جہل میں مبتلا تھے۔
☐ ...... احمد، دانش اور رحیم تینوں دوست ہیں۔

(۱) جرمنی (۲) چین (۳) قبرص (۴) کوریا (۵) نائیجر (۶) وارسا (۷) کویت (۸) بن غازی (۹) جہلم (۱۰) مردان

ساتھی بچپن کے

مسرور حسین پاشا ۱۴ سال دہم
طبیعیات آرمی
جناح انگلش ہائی اسکول
مکان نمبر ڈی/۴۹، یونٹ نمبر ۱۱ لطیف آباد، حیدر آباد

بشریٰ احسان ۱۴ سال
ہشتم انگریزی پائنٹ
گورنمنٹ جامع گرلز ہائی اسکول
سٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا

عبدالوحید مغل ۱۷ سال بارہویں
انگریزی انجینئر
شاہ لطیف کالج کراچی۔
سحر سندھ میوزک سینٹر، گھارو، ضلع ٹھٹھہ

واسع حسین شاہ ۱۷ سال گیارہویں
طبیعیات فوجی آفیسر
گورنمنٹ کالج کراچی
غریب آباد مارکیٹ، دابے جی ملز ایریا

ریحان حسین ۱۲ سال پنجم
ریاضی ڈاکٹر
اورینٹ گورنمنٹ
۱۵/۴ بشیر منزل، ٹھٹھانی کمپاؤنڈ۔ کراچی

علی جیران ۱۴ سال دہم
مطالعہ پاکستان صحافی
گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول
لوکل بازار، مخدوم پور، تحصیل کبیر والا، ضلع خانیوال

دوستی اللہ کا ایک انمول تحفہ ہے

ساتھی بچپن کے

محمد فیصل ۱۵سال نہم
بائلوجی فوجی آفیسر
پاکستان اسٹیل کیڈٹ کالج
۷/۱۱ ایس ٹی دستگیر سوسائٹی - ایف بی ایریا - کراچی

سیف اللہ جان ۱۵سال نہم
حیاتیات ڈاکٹر
بوائز ہائی اسکول
راجہ بازار، محلہ ڈاک پورہ، گلگت

جاوید اقبال ۱۶سال دہم
انگریزی وکیل بننا
گورنمنٹ ہائی اسکول مینگورہ
مجیب اللہ ڈینٹنگ ورکس، مدین روڈ منگورہ سوات

جاوید جعفری ۱۵سال دہم
بائلوجی ڈاکٹر
سٹی اسکول
سی-۱۰۰، بلاک نمبر ۷، گلشن اقبال، کراچی

محمد احسن محسن ۷سال دوم
انگریزی پولیس مین
شہاب اکیڈمی
۴۵- معین آباد نمبر ۱، ماڈل کالونی، کراچی ۲۷

غلام مصطفیٰ میرانی ۱۵سال
ہشتم ریاضی نامعلوم
ڈی-سی ہائی اسکول
علی شیر فرنیچر مارٹ نزد ڈی سی ہائی اسکول، سکرنڈ روڈ، نواب شاہ

دوستی اللہ کا ایک انمول تحفہ ہے

"کوئیز کہانی" میں شرکت کا کوپن

نام ____________ کلاس ____________

عمر ____________ اسکول ____________

پتہ ____________

____

اپنے جوابات سادے کاغذ پر لکھئے اور یہ کوپن جواب کے ساتھ منسلک کیجئے۔ بغیر کوپن کے جواب قابلِ قبول نہ ہوگا۔

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام ____________ عمر ____________

کلاس ____________ پسندیدہ مضمون ____________

مستقبل کا خواب ____________

اسکول ____________

گھر کا پتہ ____________

تصویر اس سائز میں ہو!

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) ____________

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ____________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________

رقم ____________ بذریعہ ____________

پتہ ____________

____

فون نمبر ____________

منہ نہ بنائیے
سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دہی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

* ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں
* ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے
* ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔
* ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں
* ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ ساتھی کراچی نے بقائے صحت اور بہبود اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا۔

مرتب - غلام عباس طاہر

-: مشہور شخصیات کے اصل نام :-

بعض اوقات معروف نام اتنے مشہور ہو جاتے ہیں کہ اصل نام بالکل ختم ہو کر رہ جاتے ہیں - آج ہم آپ کو چند ایسے بڑے لوگوں کے نام بتاتے ہیں جن کے اصل نام شاید آپکے ذہن میں نہ ہوں - نہ صرف آپ حیران ہونگے بلکہ آپکی معلومات میں بھی اضافہ ہو گا -

معروف نام	اصل نام
ابو بکر صدیق	عبداللہ
بایزید بسطامی	طیفور عیسی بن آدم
زین العابدین	علی بن حسین
شیخ سعدی	شرف الدین
امام باقر	محمد بن علی
داتا گنج بخش	ابوالحسن علی بن عثمان
امام بخاری	محمد بن اسماعیل
خواجہ معین الدین چشتی اجمیری	حسن سجستانی
امام مسلم	ابوالحسین مسلم
خواجہ فرید الدین بختیار کاکی	بختیار بن احمد
عبدالمطلب	عامر لقب - شیبہ)
خواجہ نظام الدین اولیاء	سید محمد بن احمد
ابوطالب	عبدالمناف
سخی لال شہباز قلندر	شیخ عثمان حروندی
ابولہب	عبدالعزی
پچل سرمست	عبدالوہاب

امّی ابّو کا صفحہ

ہما سلیم

آپ کے گھر میں کوئی نیا گلاب مہکا ہے اور اگر ولادت کا یہ پہلا موقع نہیں ہے تو یہ لمحے بڑے ہی نازک اور توجہ طلب ہیں۔

پہلے بچے کو والدین عموماً بہت زیادہ وقت، پیار اور توجہ دیتے ہیں اور ایسا ہونا فطری ہے۔ اسی طرح نئے بچے کے جنم پر ماں باپ اور اہل خانہ کا نو مولود بچے کو بہت زیادہ توجہ دینا بھی فطری ہے۔

مگر نووارد پر آپ کی خصوصی توجہ پہلے سے موجود بچے یا بچوں کے اندر یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ اب ان کی جگہ کسی اور نے لے لی ہے یا یہ کہ اب امی ابو کسی اور بچے کو زیادہ چاہنے لگے ہیں۔

یہ احساس کئی طرح کے ردِ عمل پیدا کرتا ہے۔ مثلاً بچے کا چپ رہنا یا گم سم رہنا، اپنے نئے بہن یا بھائی کو برداشت نہ کرنا، مزاج میں غصہ، جھلاہٹ یا پھر والدین سے ناراضی اور دوری۔

کم عمر بچوں پر ہونے والے ان اثرات کو معمولی نہ جانئے۔ یہ نقش ان کی شخصیت پر بہت سے منفی اثرات مرتب کرتے ہیں اور شخصیت کے بناؤ کا عمل متاثر ہوتا ہے۔

نئے بچے کی آمد پر، پہلے سے موجود بچوں کو بطور خاص زیادہ توجہ دیجئے۔ انہیں پیار کیجئے، قریب بلایئے اور سمجھایئے کے نیا آنے والا کوئی اور نہیں، تمہارا اپنا بہن یا بھائی ہے اور اسے اللہ میاں نے تمہارے لئے بھیجا ہے۔

BBM.4-91-UD-C LASER DOT

R-LINTAS

SUPER CRISP

Snacks for all seasons

مزے مزے کے چپس، دال مونگ پی نٹس نمکو مکس اور آب بادام بھی

حفظانِ صحت کے مطابق

ملاوٹ سے پاک

بین الاقوامی معیار کے مطابق

WINNER OF MERIT
EXPORT TROPHY

Tripple Em (Pvt) Ltd.
72/C-I Gulberg III, Lahore. Pakistan
Ph: 871672 - 876396 - 876797
Telex: 44925 MALIK PK
Fax: 042-870-965